

جاسوسی دنیا

27- چار شکاری

28- بے گناہ مجرم

29- لاشوں کا آبشار



جاسوسی دنیا نمبر 28

بے گناہ مجرم

(مکمل ناول)

پیش رس

اس ناول کی کہانی اپنے پیچیدہ پلاٹ کے اعتبار سے دنیا کی چند انتہائی پُر اسرار کہانیوں میں سے ایک ہے۔ ایک شخص جو قاتل ہے مگر جو بے گناہ ہے۔ ایک عورت جس نے شوہر کو دھوکا دیا! ایک عجیب و غریب گڑیا! ایک آدمی جو گرمیوں میں پاگل ہو جاتا ہے، جس کی مونچھیں، ابرو، پلکیں، چند یا سب کچھ صاف تھی! قتل کا ایک حیرت انگیز کیس! جس میں میاں حمید بے پناہ طور پر دلچسپی لے رہے ہیں۔ حمید کے انوکھے لطیفے، اس کے قہقہے آپ کبھی نہ بھول سکیں گے۔ فریدی نے زیادہ پریشانی نہیں اٹھائی۔ مگر ایک منزل پر پہنچ کر وہ بھی چکر اجاتا ہے۔ ابن صفی کا یہ دلچسپ پُر اسرار کارنامہ آپ بار بار پڑھیں گے۔

پبلشر

دو چنچیں

پرویز اس وقت چونکا جب شیشے کی دوات اس کی منہمی میں چکناچور ہو گئی۔ شیشے کے ٹکڑے اس نے فرش پر ڈال دیئے اور سیاہی بھرا ہوا ہاتھ میز پوش کے کونے میں پونچھنے لگا۔ آس پاس کوئی بھی موجود نہیں تھا، البتہ مینٹل پیس پر رکھی ہوئی گھڑی کی ”ٹک ٹک“ اسے ایسی لگی جیسے کوئی آدمی اس کی حالت پر افسوس ظاہر کرنے کے لئے ”چہ چہ“ کر رہا ہو۔

پرویز چند لمحے گھڑی کو گھورتا رہا پھر اس نے میز پر سے پیپر ویٹ اٹھا کر اس زور سے گھڑی پر مارا کہ وہ بھی جھنجھٹاتی ہوئی فرش پر آگری۔

راہداری میں قدموں کی آواز سنائی دی اور اس کا بوزھانو کر رانو دروازے کے سامنے پہنچ کر ٹھٹھک گیا۔

”بھاگ جاؤ۔“ پرویز نے چیخ کر دوسرا پیپر ویٹ اٹھایا۔

رانو سامنے سے ہٹ کر چند لمحے وہیں کھڑا رہا اور بیٹوں کے بل چلتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ وہ تین سال سے پرویز کے ساتھ تھا اور اس عرصے میں اس نے اسے ایک بار بھی ہشت تو کیا مسکراتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی دانست میں اس کا آقا دنیا کا عجیب ترین آدمی تھا۔ دنیا کا عجیب ترین جوان، جو انتہائی خوبصورت ہونے کے باوجود بھی اپنی شخصیت کو خاک میں ملا رہا تھا، جو دولت مند ہونے کے باوجود بھی دولت کی طرف سے قطعی بے پروا تھا۔ رانو نے آج تک اس کے کسی دوست کو نہیں دیکھا تھا۔ اس سے کبھی کوئی ملنے کے لئے نہیں آیا تھا۔ اور نہ وہ خود ہی کہیں باہر جاتا تھا۔ اس کا وقت یا تو اس عمارت کے کمروں میں گزرتا یا پھر پائیں باغ میں! جب اس نے یہ کوٹھی خریدی تھی تو پائیں باغ کی چار دیواری زیادہ سے زیادہ تین چار فٹ بلند رہی ہوگی، لیکن کوٹھی خریدنے کے بعد اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ چار دیواری کافی اونچی کرا دی اور

سلاخوں دار پھانک بدلو کر ایسا پھانک لگوا دینے کے بعد دوسری طرف کی چیزیں نہ دکھائی دیں۔ پڑوسیوں نے بھی اُس کی اس حرکت کو حیرت کی نظروں سے دیکھا تھا۔

رانو کو اس کی ہر عادت غیر معمولی معلوم ہوتی تھی اور ہر مشغلہ انتہائی خوفناک، وہ بعض اوقات پائیں باغ میں جال اگا کر ننھے ننھے پرندے پکڑتا۔ پھر ان میں سے نروں کو اڑا دیتا لیکن مادہ پرندوں کو ایسی ایسی اذیتیں دے کر مارتا کہ رانو کے رونٹھنے لگتے ہو جاتے۔ وہ ان کے پر نوچ کر انہیں ایسی جگہ ڈال دیتا جہاں بیویں یا بکثرت ہوتیں۔ پھر وہ گوشت کے ان لوتھروں کی پھڑک اتنی محویت سے دیکھتا جیسے اس کی روح نور کے سمندر میں غوطے اگارتی ہو۔

تتلیوں کو پکڑ کر ان کے پروں کو گوند سے چپکا دیتا اور پھر ان کے ننھے ننھے پروں کو ایک ایک کر کے بلیڈ سے کاٹتا۔ درختوں پر دوڑتی ہوئی گلہریوں پر چاقوؤں سے نشانہ اگاتا اور نوکیلے پھلوں والے چاقوان کے جسموں سے کڈر کر شاخوں میں پیوست ہو جاتے اور وہ اسی طرح چھنی ہوئی پھڑ پھڑاتی اور کر بٹاک آوازیں نکالتی رہتیں۔

رانو کبھی اس سے نفرت کرتا اور کبھی اُسے اس پر رحم آنے لگتا۔ رُہم اس وقت آتا جب وہ اُسے یونہی بلا وجہ بچوں کی طرح چھوٹ چھوٹ کر روتے دیکھتا۔

گھر میں چار نوکر تھے جن میں مالی بھی شامل تھا۔ یہ سب اپنے مالک سے بظاہر بیزار تھے لیکن اُسے چھوڑ نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ نوکروں کے معاملہ میں بڑا فراخ دل تھا۔ ان کی فروگذاشتوں پر انہیں کبھی کبھی کچھ کہتا نہیں تھا۔ اخراجات کا حساب تو خیر آج تک لیا ہی نہیں تھا۔ تنخواہیں اچھی خاصی دیتا تھا۔ ان میں سے اگر کبھی کوئی بیمار ہو جاتا تو ایسی تندہی سے اس کی دیکھ بھال کرتا جیسے وہ اس کا کوئی عزیز ہو!

بوزھے رانو کو افیون کی لت تھی۔ اس کا بار بھی پرویز ہی سنبھالے ہوئے تھا۔ مالی ہر بدھ کی شام کو شراب ضرور پیتا اور بے طرح پیتا تھا۔ اسکے اخراجات بھی پرویز ہی کی جیب سے نکلتے تھے۔ اگر وہ کبھی ان پر خفا بھی ہوتا تو بعد میں معافی ضرور مانگ لیتا۔ لہذا آج بھی یہی ہوا۔ وہ تھوڑی دیر تک اسی کمرے میں بیٹھا رہا۔ پھر باہر نکل آیا۔ اس کے چہرے پر نرمی کے آثار طاری ہو گئے تھے اور حلقوں سے ابل پڑنے والی آنکھیں پھر بوجھل سی نظر آنے لگی تھیں۔ اس کی پچھلی اداسی لوٹ آئی تھی معمول کے اوقات میں وہ مومو مالک انتہائی غمزدہ آدمی معلوم ہوتا تھا۔

”رانو....!“ اس نے رانو کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا، جو اس کی طرف پشت کئے کھڑا پا میں باغ میں کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ چونک کر مڑا اور گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”تم نے میرا تو نہیں مانا۔“ پرویز آہستہ سے بولا۔

”نہیں سرکار! بالکل نہیں....!“ رانو کی باجھیں کھل گئیں۔ ”مگر سرکار مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔“

”کس بات کا۔“

”آپ اپنی بالکل خبر نہیں لیتے.... آپ کسی ڈاکٹر....!“

”تو کیا تم مجھے پاگل سمجھتے ہو....“ پرویز نے اس کی بات کاٹ دی۔ لیکن اُس کے لہجے میں

اب بھی نرمی تھی۔

”نہیں صاحب.... مگر آپ کی صحت۔“

”مجھے کیا ہوا۔“ پرویز اپنے چوڑے چکلے سینے اور بازوؤں کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”مگر صاحب ریمسوں کی یہ شان نہیں کہ ایک کونے میں بند بیٹھے رہیں۔“

پرویز نے اسامہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”باہر کی دنیا بڑی حسین ہے صاحب۔“ رانو پھر بولا۔

”ہو سکتا ہے۔“

رانو نے محسوس کیا کہ آج پرویز کا موڈ کچھ ٹھیک ہے، ورنہ اس سے قبل کئی بار اس مسئلے پر

جھنجھلا چکا تھا۔ وہ جب بھی اس کی تنہائی پسندی کے سلسلے میں کچھ کہتا پرویز کو منہ آجاتا اور وہ اُسے

سخت دست کبہ کر دوسری طرف نکل جاتا۔ اُس نے سوچا کہ آج وہ مسئلہ بھی چھیڑے جس کے

متعلق پوچھنے کی آج تک ہمت نہیں پڑی تھی، نہ صرف رانو بلکہ دوسرے ملازمین بھی اُس معاملے

کی تہہ تک پہنچنے کے لئے بے گریز تھے۔ لیکن اُن میں سے کسی نے بھی پرویز سے تہہ

پوچھنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ رانو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کس طرح چھیڑے۔

آخر کار وہ سوچتا ہی رہ گیا.... اور پرویز.... وہ تو کبھی کا اندر جا چکا تھا۔

وہ معاملہ تھا بھی بڑا خوفناک! انہیں ڈر تھا کہ انہیں اس کی اطلاع پولیس کو نہ ہو جائے لیکن

خود انہوں نے اس کا تذکرہ باہر کسی سے نہیں کیا۔

بات دراصل یہ تھی کہ اُس کمرے تک اُن کی رسائی ہی نہیں تھی جہاں وہ سب کچھ ہوتا تھا

ورنہ نوکر تو آسمان میں تھگی اگاتے ہیں۔ اس کمرے کے دروازے میں ایک براسا قفل پرارہتا تھا جس کے کھلنے اور بند ہونے کا انحصار بند سوں کی ترتیب پر تھا۔ اور وہ ترتیب پرویز کے علاوہ اور کسی کو نہیں معلوم تھی۔ دروازے کے سارے رخنے بند کر دیئے گئے تھے، اس لئے باہر سے اندر کا حال دیکھنا قطعی ناممکن تھا۔

پرویز کا معمول تھا کہ وہ ہر رات کھانا کھانے کے بعد اس کمرے میں ضرور جاتا تھا اور پھر سارے نوکر لرزنے لگتے تھے۔ کمرے کے اندر سے ”شاپ شاپ“ کی آوازیں آتیں۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی کسی پر کوڑے برسارہا ہو۔ پھر کسی عورت کی چیخیں سنائی دینے لگتیں۔

تھوڑی دیر بعد پرویز باہر نکل کر کمرے کو مقفل کر دیتا۔ اس کے چہرے پر ایسی ہمت طاری ہوتی کہ نوکر اس سے آنکھ ملانے کی بھی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔

یہ بات آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ عورت کون تھی؟ اور کیا وہ اسی کمرے میں بند رہا کرتی تھی؟ اگر وہ اس کمرے ہی میں رہتی تھی تو اب تک زندہ کیسے تھی؟ پرویز نے یہ سلسلہ تقریباً دو ماہ سے شروع کر رکھا تھا تو کیا وہ کچھ کھائے پئے بغیر دو ماہ سے زندہ تھی۔ اس کمرے کا دروازہ دن میں کبھی نہیں کھولا جاتا تھا۔ رات کو بھی پرویز نہالی باتھ ہی اندر جاتا تھا۔ بہر حال یہ معمہ کسی طرح حل نہیں ہو سکا تھا۔

کبھی کبھی نوکر یہ بھی سوچنے لگتے تھے کہ کہیں وہ کوئی خمیٹ روح نہ ہو، راتوں اکثر راز دارانہ انداز میں بقیہ نوکروں سے کہتا۔

”صاحب پر ضرور کسی چڑیل کا سایہ ہے، حسین اور تندرست آدمیوں پر اکثر چڑیلیں عاشق ہو جاتی ہیں اور زندگی بھر پیچھا نہیں چھوڑتیں۔“

اس پر مالی کہتا۔

”میں ہوتا تو سالی کی چوٹی کاٹ لیتا۔“

”بڑے تمیں مار خاں ہیں۔“ بندو کہتا۔

”اے ہاں ہاں۔“ مالی چھاتی پر ہاتھ مار کر کہتا۔ ”ذرا عاسک ہو کر دیکھئے تو سالی، اب میرے

دادا نے بھی ایک چڑیل کی چوٹی کاٹی تھی اور مرتے دم تک اسے ازار بند میں باندھ رہے تھے۔“

”بھلا ازار بند میں کیوں باندھ رہے۔“ بندو پوچھتا۔

”بس ازار بند ہی میں تو ہاتھ نہیں اگاتیں۔“ رانو محققانہ انداز میں بولتا۔

”اچھا بابا کیا یہ سچ ہے۔ چڑیلوں کے پنجے پیچھے اور ایزیاں آگے ہوتی ہیں۔“

رانو اپنے ہونٹوں کو دائرے کی شکل میں اکڑا دیتا۔

”یار اپنے اوپر تو کوئی چڑیل بھی ماسک نہیں ہوتی۔“ بندو آہ بھر کر کہتا۔

”بس کڑیا میرے! اگر جو کہیں کوئی سن ہی رہی ہو تو۔“ شکور بول پڑتا۔

”کھدا قسم اپنے کو تو چڑیل ہی مل جاتی۔“ بندو اس طرح اڑ کر کہتا جیسے اپنے ساتھیوں پر

ظاہر کر رہا ہو کہ وہ چڑیلوں سے نہیں ڈرتا۔

شروع شروع میں انہیں رات رات بھر خیند نہیں آتی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ اس کے

عادی ہوتے گئے تھے اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ چڑیل اس کمرے سے نکل کر کلم از کلم انہیں

پریشان نہیں کرے گی، پہلے وہ یہی سمجھے تھے کہ وہ سچ مچ کوئی عورت ہی ہے، مگر جب کچھ حصہ

گذر گیا تو انہیں اپنا خیال بدل دینا پڑا۔ اگر وہ کوئی عورت تھی تو اس نے اپنی ربائی کے لئے ہنگامہ

کیوں نہیں کیا۔ اگر وہ ہاں قید تھی تو کسی وقت دن میں بھی تو اس کی آواز سنی جاتی۔

رانو بڑی دیر تک کھڑا اس معاملے پر غور کرتا رہا۔ پھر اس نے ”اونہہ“ ”نہہ“ کر اپنے شانوں کو

جھٹک دیا۔ آخر اسے ان معاملات میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ سات بج گئے تھے اور اندھیرا گہرا

ہو تا جا رہا تھا۔ باورچی خانے میں سینوں پر بھونے جانے والے مرغ مسلم کی خوشبو فضا میں تیرتی

پھر رہی تھی۔ رانو نے سچ سے زمین پر تھوک کر آستین سے ہونٹ صاف کئے اور سونے سے قبل

والی افیون کی چسکی کے خیال میں مکن ہو گیا۔ مرغ کی روغن دار ملائم ہڈیوں کا تصور بھی اس کی

روح کی جڑیں سہلانے لگا تھا اس نے سوچا کہ سالار مرغ بھی اگر ہاتھی کے برابر ہوتا تو مزہ آجاتا۔

رانو اندر لوٹ آیا۔ پرویز آنکھیں بند کئے ایک آرام کرشی پر پڑا تھا۔ اور وہ کھانے کے وقت

تک اسی طرح پڑا رہا۔

رانو باورچی خانے کے دروازے پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ صاحب زیادہ سے زیادہ

ایک ٹانگ کھائیں گے۔ کاش دوسری ٹانگ اسے مل جاتی۔ مگر وہ سالانہ دھبلا کیوں اسے دینے لگا۔

وہ ٹانگ کھلائے گا۔۔۔ شکور کو جو اسے اکثر اپنے ایک عزیز کے یہاں لے جاتا ہے جسکی لونڈیا

کرنیوں کے بھی کان کاٹتی ہے۔ اس کے حصے میں شاید پیٹھ کی ہڈی آئے۔

گھڑی نے آٹھ بجائے۔ پرویز کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ملازموں نے برتن تیشے اور باورچی خانے میں آ بیٹھے۔ رانو نے پہلے ہی تہیہ کر لیا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو گامرغ کی ٹانگ بنی پر ہاتھ مارے گا۔ لہذا کھانا سامنے رکھ کر انہوں نے بجگڑنا شروع کر دیا۔ مالی رانو کا طر فدار ہو گیا۔

”میں خوب تہمتا ہوں۔“ رانو سر ہلا کر بولا۔ ”مگر بیٹا اس سے کچھ نہیں ہوتا۔“

”لو! تھرو۔“ بندو نے پورا امرغ رانو کے سامنے بچھ دیا۔

”مطلب کیا ہے تیرا.....؟“ رانو بگڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”چل بیٹھ بھی بابا۔“ شکور اس کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھاتا ہوا بولا۔ ”چل نو ہی کھالے۔ ہی ہی ہی۔“

”اب تو سالے پر تھوکوں بھی نہیں۔“ رانو نے پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

”آج اسی کی بات مان لیتے۔“ مالی بڑبڑایا اور پھر بندو بھی پھٹ پڑا۔

لیکن ان کا یہ بجگڑا دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ پہلے انہوں نے کسی عورت کی چیخ سنی اور اس کے بعد ہی کسی مرد کی چیخ سنا دی۔

چاروں حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

”صاحب۔“ رانو نے آہستہ سے کہا اور چاروں کھڑے ہو گئے کیونکہ پرویز کی چیخ انہوں نے پہلی بار سنی تھی۔

پھر وہ چاروں اس کمرے کی طرف دوڑے۔ راہداری میں اندھیرا تھا۔ انہوں نے قریب ہی کسی کی گہری گہری سانسوں کی آواز سنی۔

”رانو..... بندو.....!“ پرویز کی گھٹی گھٹی آواز آئی۔ ”روشنی۔“

اس راہداری کا بلب کئی دن ہوئے فیوز ہو گیا تھا اور ابھی تک اسے بدل نہیں گیا تھا اس لئے یہاں عموماً اندھیرا ہی رہتا تھا۔

بندو نارنج لانے کے لئے دوڑا۔

”کیا بات ہے صاحب۔“ رانو نے پوچھا۔

”بات..... بات..... پتہ نہیں۔“ پرویز بانپتا ہوا بولا۔

اتنے میں نارنج آگئی۔ نوکروں نے پرویز کی حالت کو بڑی حیرت کی نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔ چہرے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ رہی تھیں اور وہ اس طرح

باپ رہا تھا جیسے دے کامریض ہو۔ اُس نے مڑ کر اس پراسرار کمرے کی طرف دیکھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پھر اس نے کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے نارچ پکڑی اور کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ نوکر خوفزدہ تھے، اس لئے ان میں سے کسی نے بھی آگے بڑھنے میں جلدی نہیں کی، وہ آٹھ دس قدم پیچھے ہی تھے کہ پرویز کمرے میں داخل ہوا اور نوکروں نے پھر اس کی چیخ سنی، وہ جہاں تھے وہی رک گئے۔ ہر ایک کے دل کی دھڑکنیں اس کے سر میں دھمکتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں، وہ دم بخود کھڑے رہے۔ انہیں شاید پرویز کے پکارنے کا انتظار تھا۔ پھر انہوں نے پرویز کو کمرے سے نکلتے دیکھا۔ نارچ روشن تھی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا رانداری طے کر رہا تھا۔ وہ ان کے قریب سے گذر گیا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اُسے ان کی موجودگی کا علم ہی نہ ہو۔

وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑے۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر ان کی طرف نہیں دیکھا۔
برآمدے میں پہنچ کر وہ اسی آرام کرسی پر گر گیا جس پر شام سے لیٹا ہوا تھا۔
”صاحب۔“ رانو سہمی ہوئی آواز میں بولا۔ ”کیا بات ہے؟“
”پانی....!“ پرویز کی آواز میں بہت زیادہ نقابہ تھی۔

پانی پی چکنے کے بعد اُس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور پھر کسی نے بولنے کی ہمت نہیں کی۔
رانو سوچ رہا تھا کہ وہ آج اس کمرے کو کھلا ہی چھوڑ آیا ہے؟.... آخر کیوں؟.... اور آج وہ خبر دے بھی کیوں دوبار چینا تھا؟

”پولیس کو فون کر دو۔“ پرویز تھوڑی دیر بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔
”پولیس کو....!“ رانو تقریباً چیخ پڑا۔
”ہاں۔“

”کس لئے صاحب! کیوں؟“

”میں نے اُسے مار ڈالا ہے۔“

”کسے؟“ رانو کا دم گھٹنے لگا۔

”ان سے کہہ دو کہ میں بے گناہ ہوں.... میں نے اُسے مار ڈالا ہے.... میرے خدا....“

وہی ہے؟ تم ابھی تک گئے نہیں! فون کر دو! کو تو الی کا نمبر تین سو پندرہ ہے.... جاؤ۔“

”کیا کہہ دوں۔“ رانو تھوک نکلتا ہوا بولا۔

”بہرے ہو! کیا سنا نہیں۔“ پرویز اس طرح بولا جیسے خود اسے اپنی آواز نہ سنائی دے رہی ہو۔ ”لہہ دو یہاں قتل ہو گیا ہے۔“

پُر اسرار لاش

سرِ جنت حمید نے اندھیرے میں ٹھوکر کھائی اور گرتے گرتے پچا۔ فریدی نے پلٹ کر نارنج کی روشنی ڈالی اور حمید بیٹھ کر اس پتھر کو سنبھلانے لگا جس سے ٹھوکر کئی بھی۔

”یہ کیا حماقت؟“ فریدی جھنجھلا کر بولا۔

”برابر کر رہا تھا، کہیں بُرا نہ مان گیا ہو۔“

”بالکل ہنسی نہیں آئی۔“ فریدی نے خشک لہجے میں کہا۔

”ظاہر ہے کہ اس پتھر نے بھی میرے معافی مانگنے پر مسکرا کر یہ نہیں کہا کہ کوئی بات نہیں۔“

”اٹھو نہیں تو ٹھوکر مارتا ہوں۔“ فریدی بولا۔

”البتہ اس معاملے میں پتھر آپ سے زیادہ بلند واقع ہوا ہے۔“ حمید نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ تم ہنسنے بھانسنے کے چکر میں پڑ کر بالکل احمق ہو گئے ہو۔“

فریدی بولا۔

”اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ اس پتھر سے بھی بدتر ہیں۔“

”بکو مت! زیادہ بچپنا بھی کھلنے لگتا ہے۔“

”شاید پانچ سو پچھتر ویں بار آپ یہ جملہ دہرا رہے ہیں۔“ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ظاہر

ہے کہ پانچ سو چھتر ویں بار بھی آپ یہی جملہ دہرائیں گے۔ لہذا اب اس میں کچھ رد و بدل کیجئے۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ حمید نے پھر کہا۔

”بہتر یہ ہوگا کہ اس جملے کی ترتیب بدل دیجئے۔ مثلاً زیادہ کھلنے بھی لگتا بچپنا۔ مت بکویا پھر

اس جملے کے الفاظ کے شروع کے حروف میں الٹ پھیر کر دیجئے جیسے بت بکو! زیادہ زچپنا کھی بھلتے

بگتائے۔۔۔ یا پھر آخر کے حروف۔“

”یار خدا کے لئے پچھیا چھوڑو۔“

”چھوڑ دیا۔“ حمید اپروائی سے بولا۔ ”لیکن میں کل سے اس پکڑ میں نہیں پڑوں گا۔“
 ”وہ تو پڑنا ہی ہو گا۔“

”سنئے جناب!“ حمید جھلا کر بولا۔ ”یا تو میں خود کشی کر لوں گا یا اس ڈاکٹر کو گولی مار دوں گا جس نے آپ کو ہواخوری کا مشورہ دیا ہے۔ بھلا کوئی تک ہے۔ سارے شہر کا پیدل پکڑا گاتے پھر یے۔“
 ”خود کشی سے بہتر تو یہ ہو گا کہ تم کسی تندرست آدمی کے ساتھ کہیں بھاگ جاؤ جو تمہیں کما کر کھلا سکے۔“

”بااگل نہیں.... بچا یہ جملہ۔“ حمید کھر کھراتی ہوئی آواز میں بولا۔
 ”فکر نہیں۔“

”اور یہ بھی نہیں کہ سڑکوں ہی کے پکڑ کاٹے جائیں۔“ حمید تھوڑی دیر بعد بولا۔
 ”کھاناں اور نالے بھی پھلا نکلنے۔ ڈاکٹر نے دھکے کھانے کے لئے نہیں، ہواخوری کے لئے کہا تھا۔ ساری دنیا اتنی ترقی کر گئی ہے، مگر اپنے میاں کے ڈاکٹر ڈیوٹ کے ڈیوٹ ہی رہے۔ اس زمانے میں جب کہ سارے کام مشینوں سے لئے جارہے ہیں نہ جانے ہواخوری کم بخت کیوں رجعت پسندی کے پکڑ میں پھنسی ہوئی ہے۔“

”اوہو.... تو آپ ہی سوچنے نا کوئی ترقی یافتہ طریقہ۔“ فریدی طنز یہ لہجے میں بولا۔
 ”سوچ لیا ہے؟“ حمید نے انہر کر کہا۔
 ”فرمائیے۔“

”سائیکل کا پمپ.... گھر بیٹھے ہواخوری فرمائیے۔“
 فریدی ہنس پڑا۔

”ترکیب استعمال کیلئے پتہ لکھا ہوا الفاہ اور چار آنے کے ٹکٹ ارسال فرمائیے۔“ حمید پھر بولا۔
 ”چلتے رہو چپ چاپ۔“ فریدی نے اُسے دھکا دیا۔

”سچ کہتا ہوں زندگی سے جی اُچاٹ ہو گیا ہے۔“ حمید نے کسی تھکے ہوئے بوڑھے کی طرح کہا۔ ”اب میں بقیہ زندگی یاد خدا میں گزارنے کے لئے جنوبی امریکہ چلا جاؤں گا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ بس تھکتے رہو۔ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ اگر کچھ کام نہیں تو پیدل چلو۔“

فریدی خاموشی سے چلتا رہا۔ وہ پانچ بجے سے اب تک کئی میل کا پکڑا کچلے تھے۔ اور اب بھی

دنوں سے فریدی نے اپنے ایک، اکثر دوست کے مشورے پر ہوا خوری کا مشغلہ شروع کر دیا اور اس کے ساتھ حمید کو بھی گھسٹنا پٹا تھا۔ یعنی اس کا وہ فالو وقت جو رقص گاہوں اور ٹائٹ کلبوں میں صرف ہوتا تھا اب ہوا خوری کی نذر ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ حمید نے اس پر ضرورت سے زیادہ بلز مچایا ہو گا۔ تاؤ تو اسے دراصل اس بات پر آتا تھا کہ آخر یہ خواہ مخواہ ہوا خوری کا بھوت کیوں سوار ہو گیا۔ ہوا خوری یا پیدل چلنے کا مشورہ انہیں لوگوں کو دیا جاتا ہے، جو کسی مرض میں مبتلا ہوں، لیکن یہاں اس قسم کی کوئی بات نہیں تھی۔

”تو آپ نہیں بتائیں گے؟“ حمید تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

”کیا....؟“

”یہی کہ آخر ڈاکٹر نے یہ مشورہ دیا ہی کیوں؟“

”اس لئے کہ آج کل تمہیں گہری نیند آتی ہے۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔

”مجھے....؟“ حمید بوکھلا کر بولا۔

”ہاں.... ہاں تمہیں۔“

”اور اس نے مشورہ آپ کو دیا ہے۔“

”یہ مشورہ میں نے تمہارے ہی لئے طلب کیا تھا۔“

”یعنی اتنے دنوں سے آپ مجھے اُلو بنا رہے ہیں۔“

”اُلو نہیں آدمی بنا رہا ہوں۔ اُلو تو تم سوتے وقت ہو جاتے تھے۔ ادھر سے البتہ اس الویت

میں کچھ افاقہ معلوم ہوتا ہے۔“

”یعنی....؟“

”سوتے وقت اس بُری طرح شور مچاتے تھے کہ خدا کی پناہ.... اور یوں کہ ساری باتیں

صاف سمجھ میں آتی تھیں اور وہ ساری باتیں اتنی بدبو دار ہوتی تھیں کہ ناک پھٹنے لگتی تھی۔“

”مثلاً....؟“

”مثلاً یہ کہ ہائے ہائے کیا رنگت ہے۔ ارے مار ڈالا، کیا مسکراہٹ ہے، چال ہے کہ قیامت

یہی نہیں بلکہ عورتوں کی قسمیں اور ان کے عادات و خصائل بھی گنوانے لگتے ہو۔ لمبی ناک والی

نفاست پسند ہوتی ہے۔ چھوٹی آنکھ والی خوشامد پسند اور کینہ توز ہوتی ہے۔ کلونیاں گاڑھی محبت

لڑتی ہیں۔ بڑے دانتوں والی حاسد اور شکی ہوتی ہے اور بھی نہ جانے کیا کیا ادا۔

”تو کیا یہ بد بودار باتیں تمہیں۔“ حمید نے ہنستا کر پوچھا۔

”نہیں بڑی اونچی باتیں تمہیں۔“ فریدی خشک ہنسنے میں ہوا۔

”بہر حال آپ کل سے مجھے اس طرح نہیں سنا سلتے جلا وطنی تک ہے۔۔۔۔۔ وادوار۔۔۔۔۔“

”اوہ۔۔۔۔۔!“ دفعۃً فریدی چلتے چلتے رک گیا۔ وہ اس وقت ایک آبادی کی پشت سے گزر رہے

تھے۔ انکی بائیں طرف بڑی بڑی عمارتوں کا ایک انتہائی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ حمید بھی رک گیا۔

نارنج کی روشنی کا دائرہ ایک عمارت کی دیوار پر جم گیا تھا۔

”نقب۔۔۔۔۔!“ فریدی حمید کی طرف مڑ کر ہوا۔

دیوار میں ایک اتنا بڑا سوراخ نظر آ رہا تھا جس سے ایک آدمی بیچہ کر رہے آسانی گزر سکتا تھا۔

دیوار سے نکالی ہوئی اینٹیں نیچے ڈھیر تھیں۔ فریدی نے ادھر ادھر دیکھا یہ عمارت دوسری عمارتوں سے قطعی الگ تھی۔

وہ دونوں دیوار کے نیچے آئے۔ چاروں طرف گہرا سناٹا تھا اور جھینگڑوں کی مسلسل جھانپیں

جھانپیں بھی اندھیرے ہی کا ایک جزو معلوم ہو رہی تھیں۔ فریدی نے نارنجی بھادی اور دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے ایک پتھر اٹھا کر نقب کے مہرے میں پھینکا جس کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد پھر سناٹا چھا گیا۔

دوسرے لمحوں میں وہ دونوں اندر پہنچ گئے اور نارنج کی روشنی زمین پر پڑتے ہی حمید اچھل کر

پہنچے ہٹ گیا۔ ایک عورت کمرے کے فرش پر اوندھی پڑی تھی۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔!“ حمید نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

اس کمرے میں دوسری طرف ایک ہی دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا۔ لٹڑکیاں نہیں تھیں۔ ایک

طرف ایک بڑا سا لکڑی کا صندوق رکھا ہوا تھا۔ اسی کے سامنے دوسرے گوشے میں ایک چھوٹی سی گول میز تھی، جس پر سیاہ رنگ کا ایک بکس تھا۔

فریدی تھوڑی دیر تک عورت پر جھک رہا پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

”ااش۔۔۔۔۔!“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”خدا آپ پر رحمت نازل کرے۔“ حمید بڑبڑایا۔

”تم ہمیں نہیں رو۔“ فریدی نے کہا اور دروازے سے نکل گیا۔ راہداری سنسان پڑی تھی۔ وہ دبے پاؤں چل رہا تھا۔ راہداری کے سرے پر پہنچ کر اُس نے آوازیں سنیں۔ وہ کچھ دیر کے لئے رکا اور پھر یک دم برآمدے میں آگیا۔ گھٹگو کرنے والے ٹھٹک گئے اور وہ جو آرام کرسی پر بیٹھا تھا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

فریدی انہیں تیز نظروں سے گھورتا رہا، البتہ چار آدمی نوکر معلوم ہوتے تھے۔

”کیا بات ہے؟“ فریدی نے خود ہی سکوت توڑا۔

”آپ کون ہیں؟“ پرویز کی آواز میں خوف تھا۔

”کیا آپ اس سے واقف ہیں کہ اس عمارت کے ایک کمرے میں!“ فریدی کا جملہ ختم

ہونے سے پہلے ہی پرویز پھوٹ پڑا۔

”میں بے قصور ہوں۔ وہ میرے ہاتھوں مری ہے۔ مگر میں بے قصور ہوں۔“

فریدی نے محسوس کیا جیسے وہ ہوش میں نہ ہو۔

”وہ کون ہے؟“ فریدی نے پوچھا۔

”وہ!“ پرویز اس طرح چونکا جیسے یک بیک سوتے سوتے جاگ پڑا ہو۔ ”وہ کون ہے؟“

اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں اور ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ کی جھلک

دکھائی دی پھر اگر فریدی آگے بڑھ کر اُسے سنبھال نہ لیتا تو وہ سیدھا زمین پر ہی آیا ہوتا۔ اس کی

آنکھیں بند تھیں اور سانسیں رک رک کر آرہی تھیں۔ فریدی نے اُسے آرام کرسی پر ڈال دیا۔

”کیا بات ہے۔“ فریدی نوکر کی طرف مڑا۔

وہ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

”فون ہے یہاں۔“ فریدی نے پھر سوال کیا۔

”نہیں!“ راناؤ بکا یا۔ ”پڑوس میں ہے۔“

”کوئی ڈالٹر قریب ہے۔“

”جی ہاں!“

”بالاؤ اُست، میں پولیس کا آدمی ہوں۔“

راناؤ جانے لگا۔

”ٹھہرو....!“ فریدی نے کہا اور راہداری کے سرے پر جا کر حمید کو آواز دی۔ حمید شاید راہداری ہی میں فریدی کی آواز پر دوڑ پڑا۔

”ان کے ساتھ جاؤ۔“ فریدی نے رانو کی طرف اشارہ کر کے حمید سے کہا۔ ”کو تو الی فون کر دینا.... اور ڈاکٹر....؟“

حمید نے پرویز کی طرف دیکھا۔

”بیہوش ہو گیا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”جلدی کرو۔“

حمید رانو کے ساتھ چلا گیا۔

”وہ عورت کون ہے؟“ فریدی نے بقیہ نوکروں سے پوچھا۔

”کون عورت....؟“ تینوں بیک وقت بولے اور فریدی حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

”کیا یہاں چوری بھی ہوئی ہے؟“

”نہیں تو....!“ شکور ابولا۔ شاید اُس نے اپنے خوف پر قابو پایا تھا۔ تھوڑی دیر رک کر اُس

نے کہا۔ ”مگر صاحب نے ابھی پولیس کو فون کرنے کے لئے کہا تھا۔“

”میرے ساتھ آؤ۔“ فریدی نے کہا اور راہداری کی طرف جانے لگا۔ سرے پر پہنچ کر وہ

مڑا۔ تینوں نوکروں نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی تھی۔

”کیوں....؟“ اس کی آواز بلند ہو گئی۔

”آپ ہیں کون۔“ بندو خوفزدہ آواز میں بولا۔ ”اندر کیسے آئے۔ پھانک تو بند ہے۔“

”میں تمہیں یہی دکھانا چاہتا ہوں کہ میں کیسے آیا۔“ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔

مالی آنکھیں پھاڑے فریدی کو دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اُسکے منہ سے بے ہنگم سی آوازیں نکلنے لگیں۔

”اے اے۔“ بندو اور شکور روہانسی آواز میں چیخے اور پھر انہوں نے بھی مالی کے سر میں سر

ملا نا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے تینوں کو فرنگ ہو گئی ہو۔

”چپ رہو۔“ فریدی انہیں ڈانٹ کر ان کی طرف بڑھا لیکن اُس کے قریب پہنچنے سے پہلے

ہی تینوں لہرا کر زمین پر گر پڑے۔

”کیا مصیبت ہے۔“ فریدی دانت پیس کر بولا۔ وہ تینوں بھی بیہوش ہو چکے تھے۔ اس کی

میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ کبھی وہ راہداری کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی چاروں کی طرف۔

ایک خیال تیزی سے اُس کے ذہن میں گونجا۔ کہیں یہ مکاری تو نہیں کر رہے ہیں۔ پرویز کا اعتراف جرم اُسے یاد آ رہا تھا۔ ساتھ ہی نوکروں کی لاعلمی بھی اس کے ذہن میں تھی۔ انہوں نے گھر میں کسی عورت کے وجود سے لاعلمی ظاہر کی تھی۔ پھر وہ نقب؟ آخر بات کیا ہے؟

وہ دس پندرہ منٹ تک خیالات میں کھویا رہا۔ چاروں آدمی ابھی تک بیہوش پڑے تھے۔ قدموں کی آواز سن کر وہ چونکا۔ حمید اور رانو ڈاکٹر کو لے آئے تھے۔

”اوہ.... یہ بھی گئے۔“ حمید نوکروں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”مجھے یقین تھا کہ ایسا ضرور ہو گا۔“

”کیوں....؟“

”بوڑھے سے جو کچھ معلوم ہوا تھا اس کی بناء پر میں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔“

فریدی اس پر کوئی دوسرا سوال کرنے کی بجائے ڈاکٹر کی طرف مڑا، جو پرویز پر جھکا ہوا اُسے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے سر اٹھا کر کہا۔

”یہ بیہوش نہیں! نیند ہے۔ گہری نیند، جو شاید آسانی سے نہ ٹوٹ سکے۔ کیا یہ اسونیا (بے خوابی) کا مریض ہے۔“

”پتہ نہیں۔“ فریدی آہستہ سے بڑبڑایا۔

تینوں نوکروں کے متعلق ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کی بیہوشی کی وجہ غالباً خوف ہے۔

”ایک لاش بھی ہے۔“ فریدی نے ڈاکٹر سے کہا۔

”لاش....!“ ڈاکٹر کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”جی ہاں۔ میرے ساتھ آئیے۔“ فریدی نے کہا اور حمید سے بولا۔ ”تم یہیں ٹھہرو۔“

پھر وہ رانو کو بھی اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کرتا ہوا راہداری کی طرف بڑھ گیا۔

لاش دیکھ کر رانو چیخ پڑا۔ فریدی نے آگے بڑھ کر لاش سیدھی کردی اور رانو سے پوچھا۔

”یہ کون ہے؟“

”ہم.... میں.... نہیں جانتا۔“

”کبھی نہیں دیکھا....؟“

”نہیں.... کبھی نہیں۔“ رانو نے کہا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نقب کی طرف دیکھنے لگا۔

ڈاکٹر لاش کو دیکھتا رہا۔ اس نے فریدی کے ہاتھ سے نارچ لے کر مقتولہ کی گردن دیکھی اور

کھڑا ہو کر بولا۔

”آخر بات کیا ہے۔ پولیس کو اطلاع ہوئی یا نہیں۔ اسے گلا بھونٹ کر مارا گیا ہے۔“
 ”میرا تعلق محکمہ سراغ رسانی سے ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور بات ابھی تک میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔“

ریوالور کی کہانی

پولیس آگئی تھی۔ حمید نے خاص طور سے جلدیش کو فون کیا تھا اور اتفاق سے وہ اُس وقت کو توالی ہی میں موجود تھا۔ تینوں نوکروں کو ہوش آگیا تھا۔ لیکن پرویز کی حالت بدستور وہی تھی۔ ڈاکٹر نے بھی اُس کے سلسلے میں کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے گریز کیا تھا۔ نوکروں سے پوچھ گچھ پر یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ وہ حقیقتاً بے خوابی کا مریض تھا۔ اکثر پندرہ پندرہ دن تک اُسے نیند نہیں آتی تھی۔

پرویز اور اُس کی مشغولیات کے متعلق ہر ایک نے حیرت سے سنا۔ رانو کا بیان دوسروں سے زیادہ مربوط اور واضح تھا اس لئے فریدی بار بار اسی سے سوال کر رہا تھا۔

”ہم یہاں تین سال سے ہیں۔“ رانو کہہ رہا تھا۔ ”لیکن ہم نے یہاں کبھی کوئی عورت نہیں دیکھی۔“
 ”اور تمہیں یہ یقین ہے کہ وہ نقب آج ہی کسی وقت لگائی گئی ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔
 ”جی ہاں! کل میں پچھواڑے کی طرف سے گذرا تھا۔ اس وقت میں نے نقب نہیں دیکھی تھی۔“
 ”اپنے مالک کی پچھلی زندگی کے متعلق بھی کچھ جانتے ہو۔“

”جی نہیں! نہ مجھے اُن کے رشتے داروں ہی کے متعلق کچھ معلوم ہے۔“

”کیا وہ ہمیشہ سے عجیب و غریب حرکات کرتا رہا ہے۔“

”میں نے ابھی بتایا نا آپ کو۔ کمرے والا معاملہ شاید دو ڈھائی ماہ پہلے شروع ہوا تھا۔“

”تو یہاں کبھی کوئی آتا ہی نہیں تھا۔“ فریدی نے سگار سلگاتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں.... اوہ ظہر یے.... جی ہاں چینی ہی معلوم ہوتا تھا۔“

”تم پھر بہکنے لگے۔“

”نہیں حضور! اب سے ڈھائی تین ماہ پہلے ایک چینی صاحب کے پاس آیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک بہت بڑا صندوق لایا تھا۔ وہی صندوق جو ابھی آپ نے اس کمرے میں دیکھا ہے۔“

فریدی چونک کر رانو کو گھورنے لگا پھر آہستہ سے بولا۔

”اور اسی کے بعد ہی سے تمہیں اس کمرے میں کسی عورت کی چپچپ سنائی دینے لگی تھیں۔“
”جی ہاں!...!“ رانو جلدی سے بولا۔

فریدی تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

”تمہارے مالک کے پاس خطوط وغیرہ بھی آتے رہے ہوں گے۔“

”آتے تھے اور اکثر کتابوں کے پارسل بھی آیا کرتے تھے۔ صاحب بھی خطوط لکھا کرتے تھے۔“
”کہاں سے آئے تھے۔“

”یہ تو نہیں بتا سکتا۔ میں پڑھا لکھا نہیں۔“

”تمہارے ساتھیوں میں سے کوئی بتا سکے گا۔“

”جی نہیں وہ بھی میری ہی طرح ہیں۔“

”مگر تمہارا الب ولجہ تو پڑھے لکھے لوگوں جیسا ہے۔“

”صحبت کا اثر ہے سرکار! میں ہمیشہ بڑے ہی لوگوں کے پاس رہا ہوں۔“

”تمہارے مالک کا ذریعہ معاش کیا تھا۔“

”یہ میں نہیں جانتا لیکن بیک سے میں ہی روپے لایا کرتا ہوں۔“

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر وہ سب لاش والے کمرے میں دوبارہ آئے۔ لاش ابھی تک وہیں پڑی تھی۔ فریدی نے اُس بڑے صندوق کا ڈھکن اٹھایا جس کے متعلق رانو نے بتایا تھا۔ اس میں لمبے ریشوں والی خشک گھاس اور کاغذ کی ردی بھری ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس میں کبھی کوئی چیز پیک کی گئی ہو۔ فریدی کے اشارے پر کانشیلوں نے صندوق میں بھری ہوئی گھاس فرش پر الٹ دی۔ فریدی دیر تک اُسے نارچ کی روشنی میں دیکھتا رہا پھر حمید نے دیکھا کہ وہ ایک کاغذ کا ٹکڑا تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ رہا ہے۔

”یہ تو ظاہر ہے کہ جو کچھ بھی ہوا اندھیرے میں ہوا۔“ فریدی چاروں طرف نارچ کی روشنی

ڈالتا ہوا بولا۔

”کیوں اندھیرے میں کیوں؟“ جگدیش بولا۔

”تم دیکھ رہے ہو کہ یہاں اس کمرے میں الیکٹرک فنگ نہیں ہے۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔ ”اور مجرم یہاں جو کچھ بھی کر رہا ہے اس کے لئے اس نے موم بتیاں استعمال کی ہیں۔ کیا یہ پکھلی ہوئی موم بتیوں کا موم نہیں ہے؟“ اس نے ایک طاق کی طرف اشارہ کیا۔ کچھ دیر چپ رہ کر پھر بولا۔ ”لیکن آج یہاں موم بتی بھی نہیں تھی۔ غالباً مجرم کو یہ یاد نہیں کہ کمرے میں موم بتی نہیں ہے۔“

”لیکن وہ آوازیں جو روزانہ سنی جاتی تھیں۔“ حمید نے کہا۔ اس کا کیا مطلب تھا۔ اس عورت کے متعلق تو یہی سوچا جاسکتا ہے کہ یہ اس نقب کے ذریعے اندر داخل ہوئی۔

”اور! پرویز نے اس پر حملہ کیا تھا؟ اگر یہ صورت بھی تھی تو گلا گھونٹ دینے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ پرویز اسے مار ڈالے بغیر بھی بے دست و پا کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ جسم کی بناوٹ کے اعتبار سے کافی طاقتور معلوم ہوتا ہے اور اس عورت کو تم دیکھ ہی رہے ہو۔“

”ممکن ہے پرویز بھی اُسے بھوت ہی سمجھا ہو۔“ حمید نے کہا۔ ”جس طرح نوکر آپ کو بھوت سمجھتے تھے۔ اس کمرے سے متعلق ساری چیزیں ان لوگوں کی طرح پُر اسرار ہیں۔“

”پرویز کے لئے نہیں ہو سکتیں۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”کیونکہ اس کے پُر اسرار بنانے کا ذمہ دار وہی ہے۔“

”میرے خیال سے اس عورت کے متعلق پڑوس میں چھان بین کرنی چاہئے۔“ حمید نے کہا۔

”نوکر فراڈ ہیں۔“ حمید نے منہ بنا کر کہا۔ ”سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے اس کہانی پر اعتبار کیسے کر لیا۔“

”محض اس لئے کہ اُن تینوں نوکروں کی بیہوشی مصنوعی نہیں تھی اور نہ اُن آوازوں میں بناوٹ تھی، جو بیہوش ہونے سے قبل اُن کے حلق سے نکلی تھیں۔“

”ڈاکٹر بھی اُن کا پڑوسی ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”ممکن ہے وہ بھی اس سازش میں شریک ہو۔“

”یوں تو ہم بھی اسی نقب کے ذریعے اندر داخل ہوئے تھے۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ ہم نے ہی اس عورت کو یہاں بھیجا ہو۔ کیوں بھیج دیا؟“

جگدیش ہنسنے لگا۔

”پرویز کی نیند....!“ حمید مضحکہ انداز میں مسکرایا۔ ”اس نیند کے متعلق کیا خیال ہے۔“
 ”کیا تم سمجھتے ہو کہ ڈاکٹر کی تشخیص غلط ہے۔“ فریدی اس کی طرف مڑا۔

”میں نے تو ایسی نیند کے متعلق آج تک نہیں سنا، جو بیہوشی سے بھی زیادہ گہری ہو۔“
 ”کیوں؟ کیا نوابؔ وجاہت مرزا کی نیند تمہیں یاد نہیں۔“

حمید جواب دینے کی بجائے لاش کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں نے شاید اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔“ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

تب تو معاملہ صاف ہے فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم بھی اس سازش میں شریک معلوم ہوتے ہو۔ ورنہ اس وقت میرا اور تمہارا یہاں کیا کام! تم مجھے اس طرف لائے ہی کیوں تھے۔“
 ”میں لایا تھا۔“ حمید بھنا کر بولا۔

”شاید آپ انہیں پھر پھنسانا چاہتے ہیں۔“ جگدیش نے ہنس کر کہا۔

تھوڑی دیر بعد لاش اٹھوا دی گئی اور وہ لوگ برآمدے میں آ بیٹھے۔ پرویز اب تک آرام کر رہی ہی پر تھا۔

”بیہوش ہونے سے قبل اس نے اعتراف جرم کیا تھا۔“ فریدی بولا۔ ”لیکن یہ ہے کون؟ خود اس کے ملازمین اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ ویسے آدمی دولت مند معلوم ہوتا ہے۔“
 فریدی کھڑا ہو گیا۔

”تم لوگ یہیں ٹھہرو۔“ اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔

”اب دیکھئے۔“ حمید بولا۔ ”تھوڑی ہی دیر ٹھہرنا پڑتا ہے یا قیامت تک۔“

”آپ بڑی طرح اکتائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔“ جگدیش نے کہا۔

”معلوم ہوتا ہوں۔ چہ خوب! گویا آپ کو اس میں شبہ ہے۔“

”اتنا عمدہ کیس ملا ہے آپ لوگوں کے شایان شان۔“

”کیا....؟“ حمید چیخ کر بولا۔ ”گویا میں کیسوں کے لئے مرا کرتا ہوں۔“

”نہیں بڑے بھائی بگڑتے کیوں ہو۔“ جگدیش ہنس پڑا۔

”تم نہیں جانتے کہ میں اس وقت کتنا دکھی ہوں۔“

”کیوں....؟“

”کسی عورت کی لاش دیکھ کر مجھے سب سے پہلے یہی خیال آتا ہے کہ اس کی زندگی میں اُسے کیوں نہ ملا۔“

”فرض کیجئے کہ آپ زندگی ہی میں اس سے مل لئے ہوتے تو۔“
 ”تو اس وقت میں ایک ہی نظر دیکھ کر بتا دیتا کہ وہ کون ہے اور کہاں رہتی تھی۔“ حمید نے سادگی سے کہا۔

جگدیش ہنسنے لگا۔

”کیوں! کیا میں نے کوئی یو تونی کی بات کہہ دی۔“ حمید سنجیدگی سے بولا۔

جگدیش کی ہنسی تیز ہو گئی۔

”شاید تم بھی گئے۔“ حمید مایوسی سے بولا۔

جگدیش ہنستا رہا۔

”ارے....!“ دفعتاً حمید اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا....؟“ جگدیش نے بھی اس کی تقلید کی۔ حمید تاریک راہداری کی طرف دیکھ رہا تھا۔
 جگدیش کے ساتھ تین کانشیل بھی کھڑے ہو گئے تھے۔

”وہی عورت۔“ حمید نے سرگوشی کی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

”کون عورت....!“ جگدیش نے پوچھا۔

”وہی.... جس کی لاش۔“

”کیا؟“ جگدیش سہمی ہوئی آواز میں بولا۔

حمید نے جھپٹ کر جگدیش کے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا اور راہداری کی طرف دوڑا۔
 ”ٹھہرو.... ٹھہرو۔“ جگدیش نے اُسے آواز دی۔ لیکن وہ جاچکا تھا۔ جگدیش وغیرہ راہداری کے سرے پر آکر کھڑے ہو گئے لیکن ان میں سے کوئی بھی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔
 پھر انہوں نے ایسی آوازیں سنیں، جو عموماً دھینگا مشتی کی صورت میں پیدا ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی حمید کی گھٹی گھٹی سی آواز بھی سنائی دی۔ وہ جگدیش کو پکار رہا تھا۔

”کون ہے.... خبردار“ جگدیش نے لاکار کر زمین پر پیر پٹنے لیکن اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ پھر اس نے پلٹ کر کانشیلوں کی طرف دیکھا۔ لاش والے کمرے میں کوئی دھت سے زمین پر گر اور

ساتھ ہی کسی کے دوڑنے کی آواز آئی اور پھر سناٹا چھا گیا۔

جلدیش نے حمید کو آوازیں دیں لیکن جواب نہ دار۔ اس نے رانو کے ہاتھ سے نارچ لے لی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

کمرے میں پہنچ کر انہوں نے عجیب منظر دیکھا۔ حمید زمین پر اوندھا پڑا اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت بھی نہ رہ گئی کہ وہ اُن پر زور دے کر اٹھ سکے۔ جلدیش نے جلدی سے جھک کر اُسے اٹھایا لیکن وہ اُس سے لپٹ پڑا۔

”ارے... ارے میں ہوں۔“ جلدیش بوکھلا کر بولا۔ لیکن حمید اس کی گردن میں ہاتھ دیکر جھکنا دے چکا تھا۔ اگر سپاہی آگے بڑھ کر اُسے سنبھال نہ لیتے تو وہ سر کے بل زمین پر چلا آیا ہوتا۔

”ہوش میں آؤ.... میں جلدیش ہوں۔“ جلدیش خوفزدہ آواز میں چیخا۔

حمید گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور اس نے اس طرح اپنے سر کو جھٹکے دینے شروع کر دیئے جیسے بیہوشی کے اثرات سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہو۔

”جلدیش....!“ وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تم کہاں مر گئے تھے وہ دو تھے۔“

”کون؟“

”پتہ نہیں۔“ حمید جلدیش کے ہاتھ سے نارچ لے کر چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”شاید.... وہ تمہارا بیوہ لے گئے۔“

”کیا....؟“ جلدیش تقریباً چیخ پڑا۔

”دیکھتے کیا ہو! آگے بڑھو....“ حمید بوکھلا کر بولا اور نقب کے راستے باہر نکل گیا۔ جلدیش وغیرہ بھی اس کے پیچھے لپکے۔

دوسری طرف تاریکی اور سناٹے کی حکومت تھی۔ حمید بدحواسی میں ادھر ادھر بھاگتا پھر رہا تھا۔ جلدیش اور اس کے ساتھی بھی اُس کا ساتھ دے رہے تھے وہ رکنا تو رک جاتے بھاگتا تو اس کے پیچھے دوڑتے۔

”اب کہیں وہ بھی ہاتھ سے نہ جائے۔“ حمید نے چیخ کر کہا اور نقب کے راستے پھر کو نگی میں داخل ہو گیا۔ پرویز بدستور آرام کرسی پر پڑا تھا۔

”حمید صاحب۔“ جلدیش ہانپتا ہوا بولا۔ ”بہت بُرا ہوا.... میرا بیوہ لور.... اب کیا ہوگا۔“

”میں کیا جانوں۔“ حمید بھنا کر بولا۔ ”سراسر تمہاری غلطی ہے۔ اگر تم لوگ بھی میری مدد کے لئے پہنچ گئے ہوتے تو کبھی ایسا نہ ہوتا۔“

جلد لیش بدحواس ہو کر ایک کرسی پر گر گیا۔

”ملازمت گئی۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”معطل ہو جاؤں گا۔ مقدمہ چلے گا۔“

”اگر انہوں نے مجھے مار ہی ڈالا ہوتا تو۔“ حمید غصہ سے بولا۔

”تم نے میرا ریلواریں کیوں نکالا تھا۔“ جلد لیش چیخا۔

”میں نے نہیں نکالا تھا۔“ حمید نے گردن جھٹک کر لاپرواہی سے کہا۔

”مت بکو۔“ جلد لیش نے جھلاہٹ میں گھونسا تان کر کہا۔

”کیا بات ہے۔“ فریدی کی آواز سنائی دی۔ وہ دروازے میں کھڑا حمید اور جلد لیش کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

”میرا بیڑا غرق کر دیا انہوں نے۔“ جلد لیش فریدی کی طرف مڑا۔

”کیا بات ہے۔“ فریدی نے حمید سے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“ حمید گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”یک بیک بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا ہو گیا۔ اتنا تو میں نے دیکھا تھا کہ ذرا سا اونگھ گئے تھے۔“

”مت بکو۔“ جلد لیش حلق کے بل چیخا اور پھر اچانک اس کے چہرے پر بے بسی چھا گئی۔

”آخر بتاتے کیوں نہیں۔“ فریدی بگڑ کر بولا۔

جلد لیش نے غصیلی اور روہانسی آواز میں پورا واقعہ دہرایا۔

”تم بھنگ تو نہیں پی گئے۔“ حمید برامان کر بولا۔ ”یہ سالا کچ بھوت خانہ معلوم ہوتا ہے۔“

”کیا بات ہے۔“ فریدی حمید کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا اور پری ہونٹ بھینچ کر بولا۔ ”ارے

آپ کا دماغ بھی پھر گیا۔“ حمید بے بسی سے بولا۔ ”کان دیکھئے کوئے پر غصہ اتارنے سے کیا فائدہ۔“

”دیکھو میں بہت بُری طرح پیش آؤں گا۔“

”تو آپ اچھی طرح کب پیش آتے ہیں۔“

”حمید....!“

”سرکار والا! ابھی اور اسی وقت میرا استعفیٰ منظور فرمائیے۔“

دفعۃ فریدی جگدیش کے ریوالور ہولسٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

”جگدیش کیا تم واقعی ہوش میں نہیں ہو۔“ فریدی اُسے گھور کر بولا۔

”جی.....!“ جگدیش گھبرا کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا ریوالور تمہارے ہولسٹر میں موجود نہیں ہے؟“

جگدیش نے بے اختیارانہ انداز میں ہولسٹر میں ہاتھ ڈالا اور پھر ”ارے“ کہہ کر اچھل پڑا.... ریوالور موجود تھا۔

”الو کی دم فاختہ۔“ حمید نے دانت پیس کر جگدیش کو گھورتے ہوئے کہا۔

جگدیش کا حلیہ دیکھنے کے قابل تھا۔

”ایشر قسم ان لوگوں سے پوچھ لیجئے۔“ جگدیش بوکھلا کر بولا۔ کانشیلوں اور پرویز کے نوکروں نے حیرت آمیز انداز میں بڑبڑانا شروع کر دیا۔

فریدی حمید کی طرف مڑا لیکن وہ اتنی دیر میں راہداری کے بیرونی سرے تک پہنچ چکا تھا۔ اُس نے تیز تیز قدموں سے پائیں باغ طے کیا اور پھانک سے گذر کر سڑک پر آگیا اور پھر اُس نے ایک طرف کھڑے ہو کر جو ہنسا شروع کیا ہے تو پیٹ دباتے دباتے اس کا بُرا حال ہو گیا۔

اُس نے اس وقت جگدیش کے ساتھ وہ شرارت کی تھی کہ جگدیش شاید مرتے دم تک اُسے نہ بھلا سکے۔ حقیقتاً اُسے کچھ بھی نہیں دکھائی دیا تھا اور نہ اس وقت اُس کے ذہن میں یہ شرارت تھی۔ اس نے محض جگدیش کو ڈرانے کے لئے مردہ عورت کے بھوت کا حوالہ دے کر اُس کا ریوالور چھینا تھا لیکن جب اس نے یہ محسوس کیا کہ جگدیش اور اُس کے ساتھی خوف کی وجہ سے کمرے تک آنے کی بھی ہمت نہیں کر رہے ہیں تو دفعۃً اس کے ذہن نے فلا بازی کھائی اور یہ نئی شرارت اس کے رگ وریشے میں کلبلا نے لگی۔ پھر اس نے خود ہی ایسی اچھل کود مچائی جیسے وہ کئی آدمیوں سے لڑ رہا ہو۔ بھاگنے اور گرنے والوں کی ایکنگ بھی خود ہی کی.... اور پھر جگدیش اسے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا تو اس نے چپ چاپ ریوالور اُس کے ہولسٹر میں سرکا دیا تھا۔

اول تو خالی پیٹ میں ہنسی شاذ و نادر ہی آتی ہے لیکن اگر زیادہ دیر تک آتی تو پھر ریاچ کے گولے اس بُری طرح آنتوں میں ٹھوکر مارتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ لہذا حمید کے معدے پر وہی مصرعہ صادق آ رہا تھا۔ ”رہتے رہتے دل میں تیرا درد بھی ہو گیا۔“ پیٹ میں معدے کی جگہ ایک

بہت بڑا دکھتا ہوا گولا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ شہر کی طرف چل پڑا۔ بھوک کے مارے برا حال تھا۔ یہاں کسی سواری کا دستیاب ہونا بھی مشکل ہی نظر آ رہا تھا۔ کبھی کبھی ایک آدھ کار گزر جاتی تھی۔ وہ ٹیکسی نہ ہوتی تھی۔ بہر حال وہ پیدل ہی چلنے کا تہیہ کر کے سڑک چھوڑ کر عمارتوں کے پشت والے ویران حصے میں آ گیا۔ سڑک سے جانے میں زیادہ وقت صرف ہوتا اور چلنا بھی بہت پڑتا۔

حمید چلا تو آیا تھا لیکن حقیقتاً اُس کا ذہن اُسی قتل میں الجھا ہوا تھا۔ پرویز اس کمرے میں روزانہ کسی عورت کو چیخنے پر مجبور کرتا تھا۔ اگر وہ مقتولہ ہی تھی تو اتنے دنوں تک کمرے میں بند کیونکر رہی دن میں اس نے شور کیوں نہیں مچایا۔ پھر اُس نقب کا کیا مطلب تھا۔ وہ غیر ملکی آدمی اُس بڑے صندوق میں کیا لایا تھا۔ دفعتاً حمید کو یاد آیا کہ فریدی نے اس بکس سے کوئی کاغذ نکال کر جیب میں رکھا تھا۔ وہ چلتے چلتے رک گیا۔ کہیں قریب ہی سے پٹرول کی تیز بو آرہی تھی۔

پٹرول کی بو

حمید آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں گھور رہا تھا۔ دفعتاً اسے اپنی بائیں جانب والے نشیب میں نارنج کی روشنی دکھائی دی۔ تقریباً دو ڈھائی سو گز کے فاصلے پر جہازیوں کے قریب ایک آدمی نظر آ رہا تھا جس کے ہاتھ میں نارنج تھی۔ نارنج کی روشنی میں حمید کو ایک دوسرا انسانی مجسمہ دکھائی دیا، جو ایک سفید چادر میں لپٹا ہوا زمین پر پڑا تھا۔ قریب ہی پٹرول کا ٹین رکھا تھا۔ اُس آدمی نے ٹین اٹھا کر چادر میں لپٹے ہوئے جسم پر پٹرول انڈیلنا شروع کیا۔ ہوا کے جھونکے پٹرول کی بو کو دور دور تک پھیلا رہے تھے۔

حمید نے کچھ سوچے سمجھے بغیر اسے لٹکارنا شروع کر دیا۔

”خبردار! گولی مار دوں گا۔“

اس آدمی کے ہاتھ سے نارنج گر گئی اور وہ ایک ہی جست میں جہازیاں پار کر کے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ حمید اپنی پوری قوت سے دوڑ رہا تھا اس نے زمین پر پڑے ہوئے آدمی کے پاس سے نارنج اٹھائی اور جہازیوں میں گھس گیا لیکن پندرہ بیس منٹ سر مارنے کے باوجود بھی بھاگنے والے

کا نشان نہ ملا۔

تھک ہار کر وہ پھر اسی جگہ واپس آگیا۔ چادر میں لپٹا ہوا جسم اب بھی اسی حالت میں پڑا تھا۔ حمید نے اُس کے چہرے سے چادر اٹھائی اور چیخ کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ کیا یہ اسی عورت کی لاش نہیں تھی۔ وہ لاش جسے تھوڑی دیر قبل پولیس اٹھالے گئی تھی؟ پھر یہ یہاں کیسے۔ کیا اس پر اسرار آدمی نے اس پر اس لئے پٹرول نہیں چھڑکا تھا کہ اُسے جلا دے؟ آخر وہ کون تھا اور اسے لاش کس طرح ملی۔

وہ پھر آگے بڑھا۔ مقتولہ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ حمید پھر ٹھنک گیا۔ اسے یاد آرہا تھا کہ اُس نے جو لاش کمرے میں دیکھی تھی اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن یہ کھلی ہوئی آنکھیں زندگی سے بھرپور معلوم ہو رہی تھیں۔ حمید نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا جو دبا ہی چلا گیا۔ وہ پھر بوکھلا کر پیچھے ہٹ آیا؟ کیا اس کا سر پلپلا ہے۔ یعنی سر میں ہڈی ہی نہیں۔ خوف کی ایک ٹھنڈی سی لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔

اس نے پھر جی کڑا کر کے اس کے پیر ٹٹولے لیکن وہاں بھی ہڈی نہ ارد۔ ایک خیال تیزی سے اُس کے ذہن میں گونجا اور اس نے اس جسم سے لپٹی ہوئی چادر کھینچ کر ایک طرف ڈال دی اور پھر اُسے یہ سمجھ لینے میں دشواری نہ ہوئی کہ وہ مجسمہ ربر کا تھا۔ لیکن یہ بھی کم حیرت انگیز دریافت نہ تھی۔ آخر اس کا کیا مطلب! ربر کا مجسمہ؟ جو ہو بہو مقتولہ کی نقل تھا۔

حمید تھوڑی دیر کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر اُس نے اس مجسمے کو اٹھایا اور چل پڑا۔ مجسمہ زیادہ بھاری نہیں تھا۔ تھوڑی دور چل کر وہ پھر لوٹ پڑا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اس واقعے کا تعلق بھی اسی معاملے سے نہ ہو۔ لہذا پٹرول کے ٹین اور اُس چادر کو وہیں چھوڑ دینا نامناسب معلوم ہوا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ وہ اُن سب چیزوں کو لاتا کس طرح۔ وہ کئی منٹ تک سوچتا رہا پھر اس نے پٹرول کا ٹین اور چادر جھانڑیوں میں چھپا دی۔

وہ اسی وقت پرویز کے مکان پر جا کر فریدی کو بھی اس کی اطلاع دے سکتا تھا لیکن ایک دوسری اسکیم کے تحت جو اُسے اسی وقت سوچھی تھی اس نے واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس نے اس مجسمے کو کاندھے پر اٹھایا اور چل پڑا۔ اُسے سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ نوکروں کی نظر اُس مجسمے پر نہ پڑنے پائے۔ آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گیا۔ وہ سیدھا

فریدی کے کمرے میں پہنچا اور مجھے کو اس کے بستر پر ڈال کر چادر سے ڈھک دیا۔
 اُس سے فراغت حاصل کر کے اُس نے کھانے کے لئے ہلڑ چنانا شروع کر دیا.... اور پھر
 شاید پہلا لقمہ بھی نہ اٹھایا تھا کہ فریدی اور جگدیش بھی آگئے۔
 ”آج تمہاری خیریت نہیں۔“ فریدی اُسے دکا دکھا کر بولا۔
 ”اطلاعا عرض ہے کہ میں بھی کسی سے کمزور نہیں۔“ حمید نے لا پرواہی سے کہا اور جلدی
 جلدی منہ چلانے لگا۔

”بیٹھو بھی جگدیش۔“ فریدی ڈانگ نیبل کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”میں کپڑے بدل
 کر آتا ہوں بے تکلف شروع کر دو۔ میں بھی آکر شریک ہو جاؤں گا۔“
 فریدی اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

”اور سناؤ بھائی جگدیش بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی۔“ حمید سنجیدگی سے بولا۔ ”کھاؤ تیار
 بس شروع ہو جاؤ! فریدی صاحب ابھی شیو کریں گے۔“

”میں تم سے ناراض ہوں۔“ جگدیش نے گردن اٹھا کر کہا۔ ”تم نے میرا بڑا مضحکہ اڑایا۔
 کانٹیلوں کے سامنے تمہیں ایسی حرکت نہ کرنی چاہئے تھی۔“

”خدا کی قسم! کسی دن بیچ بازار میں تمہاری بے عزتی کروں گا۔“ حمید بگڑ کر بولا۔

”اگر فرض کرو وہ حادثہ حقیقت پر مبنی ہو تا تو تم نے میری گردن ہی کٹوا دی تھی۔“

جگدیش بغلیں جھانکنے لگا.... حمید بولتا رہا۔

”تمہارے محکمے میں لومڑیوں کے علاوہ آج تک کوئی اور دوسرا جانور نظر نہ آیا.... چوڑیاں

پہن.....!“

دفعۃً حمید کے منہ کا نوالہ باہر نکل پڑا اور اس کے منہ سے عجیب طرح کی آوازیں نکلنے لگیں۔

”اہ.... اہ.... اہ.... اہ.... ایہہ۔“

اور اس لمبی سی ”ایہہ“ کے بعد وہ کرسی سے لڑھک کر زمین پر چلا آیا۔

جگدیش نے پلٹ کر دیکھا۔ فریدی اُسی مجھے کو گردن سے پکڑے ہوئے آ رہا تھا۔ حمید کو اس

طرح گرتے دیکھ کر اُس نے اُسے زمین پر ڈال دیا اور حمید کی طرف لپکا۔

جگدیش حمید کی بجائے زمین پر پڑے ہوئے مجھے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”سنو بھی۔“ فریدی نے اُسے اپنی طرف متوجہ کر کے کہا۔ ”کیا تم بھی ڈر رہے ہو۔ اماں ربر کا مجسمہ ہے۔ میاں حمید بیہوش ہو گئے ہیں۔“

فریدی کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔ جلدیش بھی اس کے قریب آگیا۔ فریدی چند لمحے حمید پر جھکار ہاتھوں میں آمیز لہجے میں بڑبڑاتا رہا۔ پھر اس نے اس کے دونوں کان پکڑ کر جو زور لگایا ہے تو وہ ”اکھڑ گئے“ کا نعرہ مار کر کھڑا ہو گیا۔

”کہاں تھا یہ مجسمہ....؟“ فریدی نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ کر پوچھا۔

”ارے میں.... خیں.... خیں.... میں کیا جانوں۔“

حمید اس کے ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹ گیا۔

”اس سے کام نہیں چلے گا بر خوردار....!“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”شرارت کے نشے میں تم اپنا رومال اسی کے نیچے چھوڑ آئے تھے۔“

”تب تو مجبوری ہے۔“ حمید اپنے کان سہلاتا ہوا بولا۔

”فضول باتیں مت کرو۔“

”میرے ایک دوست نے تحفتاً پیش کیا ہے۔“ حمید منہ چلاتا ہوا بولا۔

”تین دن تک سونے نہیں دوں گا۔“ فریدی نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

حمید نے درویشوں کی طرح ہاتھ اٹھا کر شعر پڑھا۔

”قبر میں جی بھر کے سونا زندگی کی نیند کیا

زہرو راہ عدم اٹھ اب سویرا ہو گیا“

”سچ کہتا ہوں! مارتے مارتے سویرا کر دوں گا۔“ فریدی بولا۔

”راستے میں پڑی ملی تھی۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔

”غلط کہتے ہو.... میرا خیال ہے کوئی اسے جلانے جا رہا تھا۔“

”جی....!“ حمید نوالا ہاتھ سے رکھ کر بولا.... اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ فریدی اس نتیجے

پر کیونکر پہنچا۔ پٹرول کی بو بھی اُس میں باقی نہیں رہ گئی تھی۔

”جناب۔“ فریدی پُر سکون آواز میں بولا۔ ”مذاق میں مت ٹالو.... یہ بہت ضروری ہے۔“

حمید نے رک رک کر پورا واقعہ دہرایا۔ لیکن اُس کا ہاتھ اور منہ تیزی سے چل رہے تھے۔

اسے خدشہ تھا کہ فریدی واقعات سن لینے کے بعد جائے واردات کی طرف ضرور دوڑے گا۔ لہذا پیٹ تو بھر ہی لیا جائے۔

”اور تم وہ چادر اور پٹرول کائین وہیں چھوڑ آئے۔“ فریدی بڑا سامنے بنا کر بولا۔

”بہت احتیاط سے ایک جگہ چھپا آیا ہوں۔“

”اچھا تو ختم کرو کھانا۔“

”ختم سرکار۔“ حمید نے پانی کا گلاس چڑھا کر ڈکاری اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ ”آپ

لوگ بھی کھا لیجئے۔“

”واپسی پر۔“ فریدی جگدیش کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”جی ہاں.... اور کیا؟“ جگدیش نے اٹھتے ہوئے کہا۔

فریدی نے گیرج سے جیب نکالی۔

”چلو تمہیں ڈرائیو کرو۔“ فریدی نے حمید سے کہا۔

”بہت بہتر۔“ حمید نے کہا۔ لیکن فریدی اس کی آنکھوں کی شرارت آمیز چمک نہ دیکھ سکا۔

سڑک سے گذر کر جیب ویران راستوں پر ہوئی۔ حمید جان بوجھ کر اُسے بہت زیادہ ناہموار

زمین پر چلا رہا تھا۔

”یارس بھی کرو۔“ جگدیش کراہ کر بولا۔ ڈرائیو میں جیب کے جھنکوں نے اس کی نس

نس ڈھیلی کر دی تھی۔ فریدی خاموش بیٹھا رہا۔ پتہ نہیں وہ حمید کی اس حرکت کو جان بوجھ کر نظر

انداز کر رہا تھا یا خیالات میں اس بُری طرح کھویا ہوا تھا کہ اس کی طرف دھیان ہی نہیں ہوا۔

”کیوں....؟“ حمید نے فریدی کو مخاطب کیا۔ ”آپ نے اس کا اندازہ کیسے لگایا کہ کوئی اسے

جلانے جا رہا تھا۔“

”تم اسی لئے پوچھ رہے ہو نا کہ پٹرول کی بوتلاں گئی تھیں؟“ فریدی نے پوچھا۔

”قطعاً!“

”لیکن کانوں کے سوراخوں میں خفیف سی بوباقی رہ گئی تھی اور پھر اس کے بالوں میں ایک دیا

سلانی بھی الجھی ہوئی ملی تھی۔ بہر حال تم چوک گئے۔ اس آدمی کو پکڑنا تھا۔

”پرویز کا کیا ہوا؟“

”ہم اسے ہسپتال بھجوا کر آئے ہیں، اس کی نیند میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔“

اچانک حمید نے بریک لگائی اور جگدیش کا سر اس کی پیٹھ سے ٹکرا گیا۔

”سنجھل کر بیٹھو۔“ حمید نے انجن بند کرتے ہوئے کہا اور نیچے اتر گیا۔

پٹرول کا ٹین اور چادر بدستور اُسی جگہ موجود تھے جہاں حمید نے انہیں چھپایا تھا۔

پھر وہ انہیں اُس مقام پر لایا جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ فریدی مارچ کی روشنی میں قرب و جوار کی زمین کا جائزہ لینے لگا۔ ایک جگہ تین چار دیاسلائیاں پڑی ہوئی ملیں۔

”غالباً گھبراہٹ میں گر گئی ہوں گی۔“ فریدی بولا۔ ”آدمی بہت زیادہ دلیر نہیں معلوم

ہوتا۔“

زمین سخت تھی اس لئے قدموں کے نشانات دیکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ پھر بھی

فریدی نے اس کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس لوٹ رہے تھے۔

”پرویز کے نوکروں کا کیا ہوا۔“ حمید نے پوچھا۔

”کچھ نہیں! ان کا کیا ہوتا۔“

”بہر حال بڑا پیچیدہ معاملہ ہے۔“ حمید نے کہا۔

”اب نہیں رہ گیا۔“ فریدی بولا۔ ”تھوڑی دیر قبل ضرور تھا۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”میں تم سے کب کہتا ہوں کہ سمجھو۔“ فریدی نے لاپرواہی سے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔

پھر بقیہ راستہ خاموشی ہی سے طے ہوا۔

گھر پہنچ کر فریدی اور جگدیش نے کھانا کھایا۔ دورانِ طعام میں جگدیش نے اس کیس کے

متعلق کئی بار گفتگو کرنی چاہی لیکن فریدی نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ خود بھی ابھی معاملات کی

نوعیت کو بخوبی نہیں سمجھ پایا ہے۔

جگدیش کے چلے جانے کے بعد فریدی نے خود ہی گفتگو چھیڑ دی۔

”اگر یہ ربر کا نمونہ نہ ملتا تب بھی ہم اس نتیجے پر ضرور پہنچتے۔“

”کس نتیجے پر۔“ حمید نے پوچھا۔

”یہی کہ اس کمرے میں ایک ربر کا مجسمہ تھا۔“

”تو کیا وہ اسی کمرے میں تھا۔“

”جناب۔“ فریدی۔ گار ساگاتا ہوا ہوا۔ ”اُس بڑے صندوق میں وہ مجسمہ ہی لایا گیا تھا۔“

”کہاں سے؟“

”شہر کی ایک جاپانی فرم سے جو کھلونوں کا کاروبار کرتی ہے۔ غالباً پرویز نے باقاعدہ آرڈر

دے کر اسے بنوایا تھا اور میرا خیال ہے کہ اس پر کافی پیسہ صرف ہوا ہو گا۔“

”فرم کے متعلق آپ کو ایسے معلوم ہوا؟“ حمید نے پوچھا۔

فریدی نے جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کر حمید کے سامنے رکھ دیا۔ اس پر ”جاپانیز مرچنٹس کارپوریشن۔“ چھپا ہوا تھا۔

”یہ پڑچہ اسی صندوق میں ملا تھا۔“ فریدی بولا۔

”بات کچھ کچھ سمجھ میں آتی ہے۔“ حمید نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ بھی فی الحال

قیاس ہی ہے۔“

”چلو قیاس ہی سہی! لیکن یہ بات تو نامنی ہی پڑے گی کہ ابھی تم اسی مجسمے کی شکل کی ایک لاش

دیکھ چکے ہو۔ اور وہ بھی پرویز کی گونجی کے ایک پراسرار کمرے میں۔“

”چلتے مان لی میں نے یہ بات.... پھر....؟“

”پھر یہ کہ پرویز کے عجیب و غریب عادات و اطوار۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”اچھا صاحب زادے تم نے اُس چھوٹے اور سیاہ رنگ کے صندوق کو بھی دیکھا ہو گا۔ جو ایک

چھوٹی سی میز پر رکھا ہوا تھا۔“

”کچھ یاد تو پڑتا ہے۔“

”اُسے بھی دیکھنے کی زحمت گوارا کی تھی تم نے۔“

”نہیں۔“

”اگر تم دیکھتے بھی تو اس کی اہمیت کو نظر انداز کر جاتے۔“

”کیوں؟ کیا چیز تھی اس میں۔“

”کچھ بھی نہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”وہ حقیقتاً گراموفون تھا۔“

”گرا مو فون؟“ حمید نے احمقوں کی طرح دہرایا۔

”ہاں گرا مو فون؟... کیا سمجھے؟“

”گرا مو فون ہی سمجھا؟“

”ڈیوٹ ہو! آخر اس کمرے میں گرا مو فون کا کیا کام؟ اور وہ بھی صرف گرا مو فون۔ ریکارڈ

ندارد۔ پورے گھر میں ایک بھی ریکارڈ نہ مل سکا۔“

”تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”میرے خیال سے وہ ایک فالتو چیز

ہونے کی بناء پر اس کمرے میں ڈال دیا گیا ہو گا۔ وہ کمرہ غالباً استور روم کی حیثیت سے استعمال کیا

جاتا ہے۔ کیونکہ نہ تو اس میں الیکٹرک فٹنگ ہے اور نہ کھڑکیاں وغیرہ۔“

”ٹھیک ہے! لیکن گرا مو فون کی ان استعمال شدہ سونیوں کے بارے میں کیا کہو گے جو اسی

میز پر پائی گئی ہیں۔“

”تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ چیخیں۔“

”بہت دیر میں سمجھے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”پرویز روز رات کو ایسا ریکارڈ بجاتا تھا جس میں

صرف چیخیں تھیں۔“

”لیکن وہ ریکارڈ۔“

”اس مجھے کی طرح وہ بھی گرا مو فون سے غائب کر دیا گیا۔“

”فریدی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا اور پھر حمید لاکھ کوششوں کے باوجود بھی اُسے بولنے

پر آمادہ نہ کر سکا۔“

وہ کون تھی

دوسری صبح فریدی نے سب سے پہلے اسپتال فون کیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ پرویز کی نیند بدستو

جاری ہے اور یقین کے ساتھ یہ بتانا دشوار ہے کہ اس کا سلسلہ کب ختم ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس

کے لئے سر کے آپریشن کی ضرورت بھی پیش آئے۔

فریدی ریسیور رکھ کر کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے سر اٹھا کر حمید

کمرے کی طرف دیکھا۔ حمید ابھی تک خزانے لے رہا تھا۔ فریدی نے مینڈل گھما کر دروازہ کھولا اس کی ہدایت تھی کہ سوتے وقت کمرے کو کبھی متقل نہ کیا جائے۔

”حمید....!“ فریدی نے آواز دی۔

”ارے.... ہر.... ہر.... ہٹ.... خج.... خج....“ حمید نے بڑبڑا کر کروٹ لی۔

اور پھر فریدی نے جھنجھوڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔

”کیا مصیبت ہے؟“ حمید حلق پھاڑ کر چینا۔

”خیر مجھے کیا۔ میں کہے دیتا ہوں کہ حمید صاحب نہیں ملنا چاہتے۔“ فریدی لا پرواہی سے بولا۔

”کس سے....!“ حمید نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”ایک لڑکی ڈرائنگ روم میں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“

”لڑکی....!“ حمید نے حیرت سے کہا پھر ہنس پڑا۔ ”مجھے گھس رہے ہیں، بہت اچھے۔“

”تمہاری مرضی۔“ فریدی شانوں کو جنبش دے کر جانے کے لئے مڑا۔

”ٹھہریے۔ آپ نے میرے بڑے حسین خواب کا خون کر دیا ہے۔ میں خواب دیکھ رہا تھا

جیسے میں مولشی خانے کا منشی بنا دیا گیا ہوں۔“

”تھے تو اسی قابل۔“ فریدی خشک لہجے میں بولا۔

اور پھر حمید کو یقین کر لینا پڑا کہ حقیقتاً کوئی لڑکی ڈرائنگ روم میں اس کا انتظار کر رہی ہے۔

اس نے جلدی جلدی شیو کیا اور لباس تبدیل کر کے باہر نکلا تو فریدی کو ناشتے کی میز پر دیکھا جو

نہایت اطمینان سے بیٹھا کافی کی چسکیاں لے رہا تھا۔

حمید کو پھر خیال آیا کہ شاید اُس نے اُسے اُلو بنایا ہے۔ لہذا وہ ڈرائنگ روم کی طرف جانے کی

بجائے سیدھ ناشتے کی میز کی طرف بڑھا۔

”آج موسم خوشگوار ہے۔“ اُس نے اپنے سامنے لی پلیٹ سیدھی کرتے ہوئے کہا۔

”کل بھی خوشگوار تھا۔“ فریدی بولا۔

”امید ہے کہ پرسوں بھی رہے گا۔“ حمید نے کہا اور کافی انڈیلنے لگا۔

”تو کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ چلی گئی۔“ فریدی چونک کر بولا۔

”مجھے اُسی وقت سے معلوم ہے جس وقت آپ نے اس کی آمد کی خوشخبری سنائی تھی۔“ حمید

اپروائی سے ہوا۔

”تم شاید مذاق سمجھے ہو۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ او۔“

اس نے اس کی طرف کاغذ کا ایک ٹکڑا بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اپنا پتہ دے گئی ہے اور کہہ گئی ہے کہ جلدی کی وجہ سے وہ انتظار نہیں کر سکتی۔ حمید صاحب کو بھیج دیجئے گا۔۔۔ تم اُسے کب سے جانتے ہو۔“

حمید نے تحریر پر نظر ڈالی، لیکن مسرر معنا سلیم کی شخصیت اس کے ذہن کے گوشے میں نہ ابھری۔ سرسری جان پہچان والیوں میں بھی شاید اس نام کی کوئی نہیں تھی۔ پتہ چار بناسولہ۔ دارو والا بلڈنگ تھا۔ اُسے یہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے کبھی اُس عمارت ہی میں قدم رکھا ہو۔

”میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہے؟“ حمید کاغذ پر نظر جماتے ہوئے آہستہ سے ہوا۔

”کہتے ہو۔“ فریدی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”آپ کو یقین نہ آئے گا۔“ حمید سنجیدگی سے ہوا۔ ”لڑکی فراڈ معلوم ہوتی ہے، خیر میں دیکھوں گا۔“

فریدی کچھ نہ ہوا۔ حمید تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا کہ شاید کچھ کہے لیکن اس کی مسلسل خاموشی نے خود اُسے ہی بولنے پر مجبور کر دیا۔

”آج کا پروگرام۔“

”کوئی خاص نہیں۔“ فریدی نے بے دلی سے کہا۔

”کیا آپ اس کیس میں دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔“

”قطعاً لے رہا ہوں۔“

”پھر۔۔۔؟“

”پھر کیا؟ ابھی تک کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچا۔“

”اگر میری موجودگی ضروری نہ ہو تو۔۔۔!“ حمید جملہ ختم کئے بغیر ہی خاموش ہو گیا۔

”میں جانتا ہوں کہ وہ تمہاری پرانی شناسا ہے اور تم اُس سے ملنے کے لئے ضرور جاؤ گے۔“

بہر حال میں تمہیں روکتا نہیں۔“

”شکریہ.....!“ حمید نے سعادت مندانہ انداز میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد حمید کی موٹر سائیکل دارو والا بلڈنگ کی طرف جا رہی تھی۔ دارو والا بلڈنگ شہر کی مشہور عمارتوں میں سے تھی۔ اس کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کی تیسری منزل پر محکمہ خوراک کے دفاتر تھے۔ پہلی دوسری اور چوتھی منزلوں کے فلیٹ رہائش کے لئے استعمال ہوتے تھے اور ان کا کرایہ اتنا زیادہ تھا کہ صرف ذی حیثیت لوگ ہی ان میں رہ سکتے تھے۔

حمید جو تھی منزل پر پہنچ کر سولہ نمبر کے فلیٹ کے سامنے رک گیا، جو مقفل تھا۔ دروازے کی داہنی جانب مسر عناسلیم کے نام کی تختی نظر آئی اس کا رہا سہا شبہ بھی رفع ہو گیا۔ ورنہ راستہ بھر وہ سوچتا رہا تھا کہ کہیں احقر نہ بننا پڑے۔ وہ لمبیدی کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ جب بھی حمید اسے چوٹ دینے کی کوشش کرتا اس کی طرف سے جوابی کاروائی ضرور ہوتی۔ پچھلی رات اس نے اسے اس مجسمے کے سلسلے میں بیوقوف بنانے کی کوشش کی تھی لہذا اسے خدشہ تھا کہ فریدی اس کا بدلہ ضرور لے گا۔

حمید کھڑا سوچ رہا تھا کہ برابر والے فلیٹ سے ایک لڑکی نکلی اور حمید کو وہاں کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ حمید نے پہلی ہی نظر میں اس کا پورا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ ایک قبول صورت اور الزام موذران قسم کی لڑکی تھی۔ عمر اٹھارہ انیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ نیلے اسکرٹ میں وہ کافی حسین لگ رہی تھی۔

حمید نے اپنی فلت ہیٹ اتاری اور مودبانہ انداز میں بولا۔

”کیا آپ مسر عناسلیم کے متعلق کچھ بتا سکیں گی۔“

لڑکی نے تجریمیز نظروں سے اسے دیکھا اور پھر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”آپ نہہرے۔ میں انہیں بلائے دیتی ہوں۔ غالباً چلی منزل میں ہوں گی۔“

حمید اس کا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک گرانڈیل قسم کے ادھیڑ آدمی کیساتھ واپس آئی۔ پھر وہ تو اپنے فلیٹ میں چلی گئی اور وہ آہنی دروازہ کو گھورتا رہا۔ اس نے خاکی گبرڈین کے پتلون پر چوڑی دھاریوں والی بنیان پہن رکھی تھی۔ حمید نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ نشے میں ہے۔

”کیوں..... بیٹا؟“ وہ بھاری بھر کم آواز میں غرایا۔

”کیا مطلب.....!“ حمید کی بھنویں تن گئیں۔

”ڈھمپ کئل! مطلب پوچھتے ہو۔“ اُس نے ہنس کر کہا۔ ”کہاں ہے لونڈیا؟“
 ”ہوش میں ہو یا نہیں۔“ حمید کو غصہ آگیا۔

”لونڈیا کہاں ہے؟ مارتے مارتے ڈھمپ کئل بنا دوں گا۔ بتاؤ لونڈیا کہاں ہے ڈھمپ کئل۔“
 ”شٹ اپ.....!“

”شٹ اپ سے کام نہیں چلے گا ڈھمپ کئل۔ کل رات وہ تمہارے ہی ساتھ گئی تھی،
 ڈھمپ کئل اب رد اہمانے آئے ہو۔ بتاؤ ورنہ بھیجا پھاڑ دوں گا۔“

حمید چکرا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ برابر والے فلیٹ میں دستک دے یا اسی سے
 الجھا رہے۔ اُسے ساتھ لانے والی اتنی بے تکلفی سے اپنے فلیٹ میں چلی گئی تھی جیسے تھوڑی دیر
 قبل اُس سے اور حمید سے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

”میں رعنا سلیم کے متعلق پوچھ رہا تھا۔“ حمید نے نرمی سے کہا۔

”اور نہیں تو کیا میں اُس کی ماں کے بارے میں کہہ رہا ہوں ڈھمپ کئل! بتاؤ لونڈیا کہاں ہے۔“

”ہوں۔“ حمید اوپری ہونٹ بھیجنے کر بولا۔ ”اور یہ ڈھمپ کئل کیا ہے۔“

”ڈھمپ کئل ہے۔ بتاؤ لونڈیا کہاں ہے۔“

اس بار حمید کی زبان نہیں چلی بلکہ ہاتھ چلا۔ وہ نشے میں تو تھا ہی۔ تھپڑ کا بار نہ سنبھال سکا۔
 لڑکھٹایا تو پیٹھ کھڑکی سے جا لگی۔ کھڑکی شانہ اندر سے بند نہیں تھی۔ اس کے دونوں پٹ کھل گئے
 اور توازن برقرار نہ رکھ سکنے کی بناء پر اس کی کمر دوہری ہو گئی۔ اس کے منہ سے ایک کریہہ چیخ
 نکلی اور وہ دونوں ہاتھوں سے کمر تھام کر بیٹھ گیا۔ اس پر سے حمید نے ایک ٹھوکر بھی جزدی۔
 لیکن دوسرا لمحہ ایسا نہیں تھا کہ اُسے اس آدمی کی طرف دھیان دینے کا موقع ملتا وہ بیٹھا چیخ
 رہا تھا اور ارد گرد کے فلیٹوں سے اوگ نکلتے لگے تھے

حمید کی نظریں کھڑکی سے گذر کر کمرے کے اندر لگی ہوئی ایک بڑی تصویر پر جم گئیں اور وہ
 سو فیصدی اسی عورت کی تصویر تھی جس کی لاش وہ کچیل رات کو پرویز کے یہاں دیکھ چکا تھا۔ حمید
 نے پھر ایک اچنتی سی نظر ان لوگوں پر ڈالی جو فلیٹوں سے نکل کر بالکنی میں جمع ہو رہے تھے۔ نیل
 اسکرٹ والی لڑکی چوٹ کھائے ہوئے آدمی کو فرش سے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ حمید کو
 اس بات پر بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ فلیٹ والوں نے یہ تک جاننے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ

واقعہ کیا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے انہیں چوٹ کھانے والے سے ذرہ برابر بھی ہمدردی نہ ہو۔
 ”سالے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ڈھمپ لٹل۔“ وہ پھر اٹھ کر حمید کی طرف جھپٹا۔ لیکن اس
 بار حمید کی ٹانگ چل گئی اور اُسے خود ہی اعتراف کرنا پڑا کہ اس نے اس سے پہلے کبھی اتنی شاندار
 چپر اس (غالباً فارسی میں ”چپ راست“) نہیں ماری تھی۔ وہ پھر ڈھیر ہو گیا اور اس بار اس کا سر
 دیوار سے ٹکرا گیا۔ وہ بیہوش ہو گیا تھا۔

نیلے رنگ کے اسکرٹ والی لڑکی پھر نیچے کی طرف جانے لگی۔
 ”تمہارے۔“ حمید نے اُسے مخاطب کیا۔ ”ادھر چلو! تم نیچے نہیں جاسکتیں۔“
 ”کیوں؟“ وہ پلٹ کر حمید کو گھورنے لگی۔

”اپنے فلیٹ میں جاؤ۔“ حمید تحکمانہ لہجے میں بولا۔
 ”نہیں جاتی۔۔۔۔۔ تم کون ہو۔ میں ابھی پولیس کو اطلاع دیتی ہوں۔“
 ”میں پولیس کا باپ ہوں۔۔۔۔۔ اندر جاؤ۔“

لڑکی نے تماشائیوں کی طرف دیکھا لیکن ان میں سے کسی نے بھی اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔
 معاملات آہستہ آہستہ حمید کی سمجھ میں آتے جا رہے تھے۔

”لڑکی۔۔۔۔۔ مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔ میں تمہیں اچھی طرح پہچانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں
 کہ یہ شریف آدمی تمہاری طرف داری کیوں نہیں کر رہے ہیں۔ اندر جاؤ۔“
 بیہوش آدمی ابھی تک وہیں پڑا ہوا تھا کسی نے یہ بھی دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ وہ زندہ
 ہے یا مر گیا۔ دفعتاً حمید نے آگے بڑھ کر اس لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور اُسے اس کے فلیٹ میں دھکیل کر
 دروازہ باہر سے بند کر لیا۔

”آپ کون ہیں؟“ تماشائیوں میں سے ایک نے پوچھا۔
 ”سرکاری آدمی۔“ حمید آہستہ سے بولا۔ ”ذرا ادھر آئیے۔“
 حمید رعا سلیم کے فلیٹ کی کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس آدمی کے قریب
 ہی اُس نے تصویر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”وہ رعا سلیم ہی ہے۔“
 ”جی ہاں!“ اس نے سر ہلا کر کہا اور حمید کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔

”اس کارمنا سے کیا تعلق ہے۔“ حمید نے بیہوش آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

”تعلق! کیا بتاؤں۔“ اس نے کہا۔ ”ان سب نے مل کر ہماری زندگی تلخ کر رکھی ہے۔ اچھا

ہی کیا آپ نے جو مارا تھا کو نیچے نہیں جانے دیا ورنہ وہ اس کے ساتھیوں کو بلا ایتی۔“

”ان دونوں کے علاوہ کوئی اور بھی لڑکی یہاں ایسی ہے۔“

”نہیں.... صرف یہی دونوں.... اور یہ مائیگر۔“ اس نے بیہوش آدمی کی طرف اشارہ

کر کے کہا۔ ”ایک خطرناک قسم کا فندہ ہے۔ ان دونوں سے پیشہ کرتا ہے۔“

”کیا اس کا نام مائیگر ہے؟“ حمید نے پوچھا۔

”نام کوئی نہیں جانتا۔ وہ خود کو فخریہ مائیگر کہتا ہے اور امریکی ڈاکوؤں کی طرح کا لباس پہنتا ہے۔“

”ہوں.... یہاں کہیں قریب فون ہے۔“

”جی ہاں.... میرے فلیٹ میں۔“ متاثرینوں میں سے ایک نے کہا۔ ”میرے ساتھ آئیے۔“

”آپ لوگوں نے پولیس کو اس کی اطلاع کیوں نہیں دی۔“ حمید نے اس سے پوچھا۔

”اپنی شامت بلواتے یہ اور اس کے ساتھی ہمیں زندہ نہ رہنے دیتے۔ معاف کیجئے گا پولیس

خود اس سے پیسے کھاتی ہے۔“

تھوڑی دیر بعد حمید انسپکٹر جلدیش کو فون کر رہا تھا۔

”ہیلو.... انسپکٹر جلدیش.... میں حمید بول رہا ہوں.... مقتولہ کی رہائش کا پتہ چل گیا۔ دارو

والا بلڈ ٹک کی چوتھی منزل پر فوراً پہنچو۔“

حمید سوچ رہا تھا کہ آخر فریدی کو مقتولہ کا ٹھکانہ کیسے معلوم ہوا۔ اسے اس کے نام کا علم

کیونکر ہوا۔ یہ بات تو اس کی سمجھ میں اچھی طرح آگئی تھی کہ اس وقت فریدی نے دراصل اس

سے پچھلی رات والی شرارتوں کا بدلہ لیا تھا۔

”اس فندہ کے دوسرے ساتھی کہاں ہوں گے۔“ حمید نے ایک سے پوچھا۔

”نیچے پہلے مالے میں فرینڈز ہوٹل جو ہے نا۔ وہ اسی سالے کا ہے اور اس کے ساتھی وہیں

ہوتے ہیں۔“

دارو والا بلڈ ٹک سے کو تو اب زیادہ دور نہیں تھی اس لئے جلدیش کو وہاں پہنچنے میں دیر نہ لگی۔

”فریدی صاحب کہاں ہیں۔“ جلدیش نے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“ حمید بولا۔ ”سب سے پہلے اُن فنڈوں کو پکڑنا ہے۔“

فلپ والوں کی شناخت پر نائیگر اور اس کے ساتھیوں کو حراست میں لے لیا گیا۔ نائیگر کو ہوش آگیا تھا اور وہ بوکھلائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ نیلے اسکرٹ والی مار تھا بھی حراست میں لے لی گئی۔ یہ بات تو ظاہر ہی ہو چکی تھی کہ وہ لوگ ان لڑکیوں سے پیشہ کراتے تھے لہذا حمید نے اُن سے رونا کے متعلق پوچھ گچھ شروع کی۔

”تم نے یہ کیسے اندازہ لگالیا تھا کہ کل رات کورنا جس کے ساتھ تھی وہ میں ہی تھا۔“ حمید نے مار تھا کو مخاطب کیا۔

”میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔“ مار تھا نے آہستہ سے کہا۔ ”لیکن اس نے سوٹ اسی قسم کا پہن رکھا تھا۔“

”کیا وہ یہاں آیا تھا؟“

”نہیں۔“

”پھر تم نے انہیں کہاں دیکھا تھا۔“

”آر لکچو میں۔“

”تو تم نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔“

”نہیں۔“

”یہاں اُس کے پاس کون کون آتا تھا۔“

”یہاں کوئی نہیں آتا۔“ مار تھا نے کہا اور سر جھکا لیا۔

”سو سائنی کر لزو والا رویہ ہو گا ان کا۔“ جلدیش مسکرا کر بولا۔

”کچھ ایسے آدمیوں کے متعلق بتا سکتی ہو جن کے ساتھ تم نے اُسے کبھی دیکھا ہو گا۔“

”یہ بتانا مشکل ہے۔ ہم دونوں کبھی ساتھ نہیں رہے۔“

”کیا تم جانتی ہو کہ کسی نے اُسے پچھلی رات کو قتل کر دیا؟“

”کیا...؟“ مار تھا چیخ اٹھی۔ اس کی آنکھیں خوف اور حیرت سے پھیل گئیں تھیں۔

”صاحب ہم بے قصور ہیں۔“ نائیگر ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔ اس کے چہرے پر بھی ہوائیاں

ازنے لگی تھیں۔

حمید رمناسلیم کے فلیٹ کی تلاشی لینے کے متعلق سوچنے لگا۔

ایک تصویر

واپسی پر حمید کا سینہ فخر سے پھولا ہوا تھا۔ پورٹیکو میں قدم رکھتے ہی اُس نے انگریزی سڑکوں میں سیٹی بجانی شروع کر دی۔ تلاشی کے دوران میں اس نے چند ایسی چیزیں دریافت کی تھیں جن کی اس کی نظروں میں بڑی اہمیت تھی۔

نو کروں سے معلوم ہوا کہ فریدی تجر بہ گاہ میں ہے۔ حمید بڑی شان سے زینے طے کرتا ہوا اوپری منزل پر پہنچا۔ فریدی اسٹریٹ میں کوئی سیال شے ڈالے ہوئے اسپرٹ لیمپ کی لوپر گردش دے رہا تھا۔ حمید کی آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر مشغول ہو گیا۔ حمید تھوڑی دیر تک خاموش کھڑا رہا لیکن جب فریدی اس کی طرف متوجہ نہ ہوا تو وہ خود ہی بولا۔

”رمناسلیم آپ کے حسن کی بڑی تعریف کر رہی تھی۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم کوئی حماقت کر کے آئے ہو۔“ فریدی بدستور سر جھکائے ہوئے بولا۔

”جی ہاں! میں نے اُس سے آپ کی شادی طے کر دی ہے۔“

”شکریہ۔“ فریدی لاپرواہی سے بولا اور پھر اسٹریٹ میں لیمپ سے ہٹا کر آنکھوں کے قریب لے جاتا ہوا بڑبڑایا۔ ”یہ ذرات تحلیل نہیں ہو سکتے۔“

”خواہ میری کھوپڑی تحلیل ہو کر دریاے نرہدا ہو جائے۔“ حمید اپنا اوپری ہونٹ بھیچھ کر

بولا۔

”یہ مضاائقہ ہے؟ لیکن یہ ذرات۔“

”میں کہتا ہوں آخر اس طرح اُلو بنانے کی کیا ضرورت تھی۔“ حمید جھنجھلا کر بولا۔

”محض اُس لئے کہ میں تمہیں انگلی پکڑ کر نہیں چلانا چاہتا۔“

”نہیں بلکہ گردن پکڑ کر دکھادینا چاہتا ہوں۔“ حمید نے منہ بنا کر کہا۔

”سنو! اس کیس کو تمہیں ہی پھانسا ہے۔ میں آج کل بہت مشغول ہوں۔“ فریدی نے کہا اور

اسٹریٹ میں چلنے لگا۔ ایک برتن میں انڈیل دی۔ پھر اس نے رومال سے دونوں ہاتھ صاف

کر کے۔ گار ساگایا اور حمید کے چہرے پر نظریں جماتا ہوا بولا۔ ”بک چلو۔“
 ”بک بک بک۔“ حمید نے ٹہلنا شروع کر دیا اس حرکت میں جھنجھلاہٹ بھی شامل تھی۔
 فریدی ہنس پڑا۔

”میں کہتا ہوں اگر میں پٹ جاتا تو۔“ حمید پلٹ پڑا۔
 ”آئندہ کے لئے سعادت مند ہو جاتے اور کیا۔“
 حمید نے سوچا کہ زیادہ بات بڑھانا مناسب نہیں آخر اسے اپنی کارگزاریوں کی دھاک بھی تو
 بٹھانی تھی۔

”آپ کو اس کا نام اور پتہ کیسے معلوم ہوا تھا۔“ حمید نے پوچھا۔
 ”اس کے ملاقاتی کارڈ سے، جو اس کے پرس سے برآمد ہوا تھا۔“
 ”رات آپ نے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔“
 ”کیوں؟“
 ”یونہی۔۔۔۔۔!“

”اس تصویر کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔“ حمید نے اپنی جیب سے ایک تصویر نکال کر
 فریدی کے سامنے ڈال دی۔ یہ اسی تلاشی کے دوران میں ملی تھی۔
 ”معاملہ بالکل صاف ہو گیا۔“ فریدی آہستہ سے بڑبڑایا۔
 اس تصویر کے متعلق حمید نے بھی کچھ سوچا تھا لہذا وہ فریدی کی رائے معلوم کرنے کے
 لئے بے چین ہو گیا۔

”اور یہ کہ وہ ایک پیشہ ور قسم کی سوسائٹی گرل تھی۔“ حمید نے کہا اور پوری روداد دہرا دی۔
 فریدی خاموش ہو گیا۔ اس کا چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ دفعتاً وہ
 معنی خیز نظروں سے حمید کی طرف دیکھنے لگا۔

”اس نے اُن دونوں کو آر لپو میں کس وقت دیکھا تھا؟“ فریدی نے پوچھا۔
 ”ساڑھے چھ اور سات کے درمیان۔“

”ٹھیک۔“ فریدی پھر سوچ میں پڑ گیا۔
 حمید تھوڑی دیر تک خاموش رہا لیکن پھر فریدی کی خاموشی برداشت سے باہر ہو گئی۔

”ابھی آپ نے کہا تھا کہ معاملہ صاف ہو گیا۔“

”اوں!“ فریدی نے چونک کر انگڑائی لی اور حمید کی طرف دیکھ کر مسکرائے اگا۔

”معاملہ قطعی صاف ہو گیا۔ پرویز حقیقتاً وہاں اس عورت کی موجودگی سے لاعلم تھا اور اس نے اسی ربر کے مجسمے کے دھوکے میں اس کی گردن دبا دی۔“

”کیا پرویز کو ہوش آگیا۔“ حمید نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”پھر آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔“

”اس سلسلے میں جتنے بھی واقعات پیش آئے ہیں انہیں یکجا کر کے ترتیب دے لو اور پھر پرویز کی پچھلی زندگی اور اسکے عادات و اطوار کی روشنی میں ان کا جائزہ لو۔ بات سمجھ میں آجائے گی۔“

”مجھے ان اوگوں کے بیان پر شبہ ہے۔“ حمید بولا۔

”کیوں؟“

”مجھے وہ بھی اس سازش میں شریک معلوم ہوتے ہیں۔“

”کیا تم قتل کے مقصد سے واقف ہو۔“ فریدی نے پوچھا۔

”نہیں؟“

”پھر تم نے لفظ سازش کیسے استعمال کیا۔“

”میرا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی پرویز سے ملے ہوئے ہیں۔“

”غلط سمجھئے... یہ ہو سکتا ہے کہ وہ سب یا ان میں سے کوئی اُس آدمی سے تعلق رکھتا ہو جس کی وجہ سے یہ حادثہ رونما ہوا۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”یہ قتل پرویز سے ناوانشتگی میں کرایا گیا ہے۔“

”کس طرح؟“

”جس طرح تمہاری کھوپڑی الٹ گئی ہے۔“ فریدی ہنسنے لگا اور بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ اس

وقت تمہارا ذہن اس عورت میں الجھا ہوا ہے جسے پولیس کے سپرد کر آئے ہو۔“

”اس سے میں بہت بڑے بڑے کام لینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“ حمید انٹر کر بولا۔

”بلو مت۔“ فریدی تجر بہ گاہ سے نکل کر نیچے چلا گیا۔ حمید نے منہ بنا کر اپنے شانے سکڑے اور وہ بھی اُس کے پیچھے چل پڑا۔

فریدی ابھی زینوں ہی پر تھا کہ باہر کی کھنٹی بجی۔ شاید کوئی ملاقاتی تھا۔ وہ کچھ دیر صحن میں کھڑا رہا لیکن جب کوئی کسی کا ملاقاتی کارڈ لے کر اندر نہ آیا تو وہ خود ہی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ آنے والا شاید اسی کے محلے سے تعلق رکھتا تھا ایسے لوگوں کے لئے ملاقاتی کارڈ کی رسمی قید نہیں تھی۔ وہ عموماً کھنٹی استعمال کرنے کے بعد ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتے تھے۔ حمید برآمدہ ہی میں تھا کہ فریدی ڈرائنگ روم سے واپس آ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔

”کچھ نہیں.... فضول.... میں پہلے ہی سمجھا تھا۔“ وہ کاغذ پر نظریں جمائے ہوئے بڑبڑایا۔
”کیا....!“

”فنگر پرنٹ والوں کی رپورٹ ہے۔ پٹرول کے ٹین پر تمہاری انگلیوں کے نشانات کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا۔“

”اُس نے دستاویز پکڑ رکھے ہوں گے؟“

”ہاں کافی ہوشیار آدمی معلوم ہوتا ہے۔“

”ہو گا.... اُس معاملے کو بھی تو صاف کیجئے نا۔“ حمید اکتا کر بولا۔

فریدی تھوڑی دیر تک اُسے گھورتا رہا پھر بولا۔

”پرویز نے اُس عورت کی نقل کیوں تیار کرائی تھی۔“

”بد بنتی تھی سالے کی۔“ حمید نے بھنکا کر کہا۔

”اور چیخوں والا ریکارڈ کیوں بنوایا تھا۔“ فریدی روم میں بولتا رہا۔ ”اُس کی شخصیت اتنی پراسرار کیوں تھی؟ وہ دنیا سے بے تعلق اُس عمارت میں کیوں بند رہتا تھا؟ اُس نے اندر اذیت پسندانہ جہانات کیوں پیدا ہوئے تھے؟“

حمید خاموش رہا۔

”اُس نے دو ماہ قبل جاپانیز مرچنٹس کارپوریشن کے ذریعہ ایک ایسا مجسمہ تیار کرایا، جو ایک عورت کی نقل تھا۔ ایک ایسا ریکارڈ تیار کرایا جس میں صرف چینی تھیں۔ کل رات اُسے اس

کمرے میں مجسے کی بجائے اُس عورت کی لاش ملی جس کی نقل وہ مجسمہ تھا۔ پھر تم نے کسی نامعلوم آدمی کو دیکھا، جو اس مجسمے کو جانے کی کوشش کر رہا تھا اس کا مطلب یہ ہوا کہ کل رات اس مجسے کی جگہ اس کی ہم شکل عورت نے لے لی تھی۔ آخر پرویز نے اُسے مار بھونکا اور اعتراف جرم کے ساتھ ہی ساتھ اپنی بے گناہی کیوں ثابت کرنا رہا۔“

فریدی خاموش ہو کر حمید کی طرف دیکھنے لگا پھر آہستہ سے بولا۔ ”مرچنٹس کارپوریشن کے منتظم نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ مجسمہ خاص طور سے آرڈر دے کر بنوایا گیا تھا۔ اُس کے لئے پرویز نے اس عورت کی پوری تصویر دی تھی ساتھ ہی ریکارڈ کا آرڈر بھی۔“

”چلنے میں سمجھ گیا کہ وہ مجسمہ بنوایا گیا تھا؟“ حمید نے کہا۔ ”لیکن میں اس پر کیسے یقین کر لوں کہ پرویز نے اُسے نادانستگی میں مار ڈالا۔“

”اس کی بھی وجہ ہے تم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھ سکتے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

تم اس نقب کو کیوں بھول گئے۔ چلو خیر اسے بھی جانے دو۔ پرویز نے اگر اسے جان بوجھ کر مار ڈالا تھا تو اس نے اُس کی لاش کو ٹھکانے کیوں لگا دیا اس کے لئے کافی موقع تھا ظاہر ہے کہ اگر وہ رات بھر بھی اس کمرے میں بند رہتا تو کسی نوکر کی ہمت اس کے قریب آنے کی نہ پڑتی کیونکہ وہ اُس کمرے ہی سے خائف تھے۔

”نہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”میں اُس نقب کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اُس نقب ہی کی بناء پر کہہ رہا ہوں کہ پرویز نے اُسے جان بوجھ کر قتل کیا تھا اور اسے ٹھکانے لگا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے اُسے مار ڈالنے کے بعد خود ہی نقب لگائی مگر نہیں... اگر یہ بات تھی تو وہ کمرے کے اندر کس طرح پہنچی تھی۔“

فریدی نے قہقہہ لگایا۔ ”بس بوکھلا گئے۔ چلو سنو! تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ اُس نے اُسے جان بوجھ کر یا اپنے ہوش میں قتل کیا۔ ہو سکتا ہے کہ میری تھوڑی غلط ہو لیکن میر نے امکانات ہی کی روشنی میں اُسے مرتب کیا ہے۔ میری دانست میں کسی شخص نے، جو پرویز اور اس کے معمولات سے اچھی طرح واقف تھا اس عورت کو نقب کے راستے کمرے میں پہنچایا اور اُسے وہیں ٹھہرنے کی تاکید کر کے وہ ریکارڈ اور مجسمہ وہاں سے نکال لے گیا اور ہو سکتا ہے کہ اُس نے وہاں دیا سلائی اور موم بتی بھی غائب کر دی ہو۔ اس کے جانے کے بعد پرویز اندر داخل ہوا:

اور اندھیرے میں اس عورت کو مجسمہ ہی سمجھ کر اس کا گلا گھونٹنے لگا ہو۔“

”بھلا جسے کا گلا گھونٹنے سے کیا مراد؟“ حمید نے اُسے ٹوکا۔

”تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ گراموفون پر چیخوں کا ریکارڈ لگا کر اُس جسمے کی پوجا کرتا رہا ہوگا۔ کیا تمہیں نوکروں کا بیان یاد نہیں۔ کیا پرویز کی ان حرکتوں کا علم نہیں جو وہ ننھے ننھے پرندوں گلہریوں اور تیلیوں کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ کیا تم اس کا مطلب بتا سکتے ہو کہ وہ نر پرندوں کو چھوڑ کر صرف مادہ پرندوں ہی کو کیوں اذیت دیتا تھا۔۔۔ بہر حال“ وہ تھوڑی دیر رک کر پھر بولا۔ ”میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر وہ عورت اُسے روز روشن میں کہیں مل جاتی تو وہ اُسے زندہ نہ چھوڑتا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ۔۔۔۔!“

”قطعاً! میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اُس سے یہ قتل نادانستگی میں سرزد ہوا۔“

”آخر وہ کون ہو سکتی ہے۔“ حمید بڑبڑایا۔

”عورت۔۔۔ عورت۔۔۔ عورت۔“ فریدی دانت پیس کر بولا۔

حمید اُسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

”یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس سے پیچھا چھڑانا محال ہے؟ یہ صرف انہیں لمحات میں تم پر جان دیتی ہے جب تم نے اُس کے جذبات ابھار دیئے ہوں اور اس کے علاوہ وہ صرف ماں بن سکتی ہے، بہن بن سکتی ہے اور بیٹی بن کر وفادار رہ سکتی ہے۔“

”میں نہیں سمجھا؟“ حمید بوکھلا کر بولا۔

”کچھ نہیں میں نے ایک غیر متعلق بات شروع کر دی تھی۔ ویسے مختصر یہ کہ رعنا کبھی نہ کبھی پرویز کی بیوی ضرور رہی ہوگی۔“

”بیوی!“ حمید تقریباً چیخ پڑا۔

”قیاس ہے۔ فی الحال میرے پاس اس کا واضح ثبوت نہیں۔“

”اگر وہ اس کی بیوی تھی تو میں بیویوں کے مستقبل سے مایوس ہوں۔“

”بیوی!“ فریدی پُر خیال انداز میں بڑبڑایا۔ ”شٹ اپ۔۔۔ اس لفظ کو بار بار نہ دہراؤ۔“

”کیا کفن اور کافور دکھائی دینے لگتا ہے آپ کو۔“ حمید ہنس پڑا۔

فریدی پھر کسی خیال میں ڈوب گیا۔

”نہ آپ شادی کرتے ہیں اور نہ دوسروں ہی کو شادی شدہ دیکھ سکتے ہیں۔“ حمید نے چٹکی لی۔
 ”میں نہیں چاہتا کہ تمہارا محبوب ترین موضوع گفتگو دیر تک جاری رہے۔“ اس نے کہا اور
 چند لمحوں کے لیے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے کچھ سوچتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔ ”بہر حال وہ عورت
 بھی دھوکے ہی میں ماری گئی۔“

”کیوں؟“

”تم شاید پیچھ اور سوچ رہے ہو۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”وہ وہاں مرنے کی نیت سے تو نہ آئی ہوگی۔“
 ”ظاہر ہے۔“

”میرا تو خیال ہے کہ پرویز یہ جانتا ہی نہ رہا ہو گا کہ وہ بھی اسی شہر میں مقیم ہے۔“ فریدی نے
 ہنسا ہوا۔ کار ساگا کر کہا۔ ”تم بالکل الو ہو! تم نے مجھے فون کیوں نہیں کیا۔ اُس دوسری لڑکی کو
 حراست میں نہ لینا تھا۔“

”کیوں...؟“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ہزاروں طیلے تھے۔ خیر جو کچھ بھی ہوا بہتر ہی ہوا۔ اب کیا کرنا ہے؟“ وہ سوالیہ نظروں سے
 حمید کو دیکھنے لگا۔

”غالباً پرویز کی بیہوشی رفع ہونے کا انتظار ہی بہتر رہے گا۔“ حمید بولا۔

”مہمل۔“ فریدی بڑبڑایا۔ ”اُس سے کیا ہو گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اپنا اور اس عورت کا تعلق
 ظاہر کر دے گا۔ اس آدمی کے متعلق شاید وہ بھی کچھ نہ بتا سکے جو اس قتل کا باعث بنا ہے۔“
 ”کیوں؟“

”پھر وہی کیوں؟“ فریدی جھنجھلا گیا۔ ”تم آدمی ہو یا کسی کی نقل۔ یا انیون کھار کھی ہے اگر
 اس آدمی کو یہ یقین ہوتا کہ پرویز کی شخصیت پر روشنی ڈال سکے گا تو وہ ایسی حرکت ہی نہ کرتا۔“
 حمید کچھ نہ بولا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر فریدی کہنا کیا چاہتا ہے۔

”اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اُس نے اُس عورت کو پرویز ہی کے ہاتھوں کیوں قتل کر لیا؟“
 فریدی تھوڑی دیر بعد بولا۔

”ضرور دیکھئے۔“ حمید نے بے دلی سے کہا۔ وہ حقیقتاً اس لڑکی کے متعلق سوچنے لگا تھا جسے وہ

پولیس کے حوالے کر آیا ہے۔ ان دنوں اس کی زندگی کچھ خشک سی گذر رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ تفتیش ہی کے بہانے اس سے تھوڑے بہت تعلقات پیدا کر لیتا تو یہ پہاڑ سے دن اور اجاز سی راتیں اتنی گراں نہ گذرتیں وہ سوچتا رہا اور فریدی بولتا رہا۔ ”پرویز کی نیند کا سلسلہ شاید ابھی ختم نہ ہو۔ سالہا سال کی بے خوابی کا شکار ذہن کچھ دن آرام ضرور کرے گا جس خلش نے اُسے نیند سے محروم کر دیا تھا وہ رفع ہو گئی۔“

”کون سی خلش؟“ حمید چونک کر بے خیالی میں بولا۔

”یہ خلش کہ حمید کی موت فریدی کے ہاتھوں واقع ہو گئی۔“ فریدی نے اوپری ہونٹ بھیج کر کہا۔

”آخر آپ آج کاٹنے کو کیوں دوڑ رہے ہیں۔“

”تمہیں یہاں آنے کی بجائے آر لکچو میں جانا چاہئے تھا، ممکن ہے کہ وہ دونوں وہاں روز

جاتے رہے ہوں۔“

”میں کہتا ہوں سیدھا راستہ اختیار کیجئے۔“ حمید نے کہا۔ ”پرویز کے نوکروں میں سے کوئی اس

آدمی کو ضرور جانتا ہوگا۔ کیونکہ پرویز کا کوئی نوکر ہی اُسے پرویز کے معمولات سے باخبر کر سکتا ہے۔“

”مجھے یقین ہے کہ وہ سب اس سے لاعلم ہیں۔“ فریدی کے لہجے میں خود اعتمادی تھی۔

دوسرا پاگل

تین دن گذر گئے۔ لیکن پرویز کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ پھر بھی ڈاکٹروں کو توقع تھی کہ وہ خود ہی کسی وقت ہوش میں آجائے گا۔

اس دوران میں فریدی اور حمید دونوں بے حد مشغول رہے۔ حمید نے اپنے شعبے کے مطابق پرویز کے نوکروں کو ہر طرح بلایا جلیا لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ آر لکچو کی تحقیقات میں بھی مایوسی ہی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس سے فریدی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ رعنا اور وہ گم نام آدمی روزانہ کے گاہکوں میں سے نہیں تھے۔ فریدی پرویز کے کاغذات میں بھی الجھا رہا۔ یہ بھی تو دیکھنا تھا کہ آخر پرویز کون ہے۔ اس کا ذریعہ آمدنی کیا ہے؟ اس کے دوسرے اعزہ بھی ہیں؟ اگر ہیں تو کیا ہیں؟ حمید اس کی مصروفیات میں نخل نہ ہوا اور نہ ہی اس نے اس سے یہی دریافت کیا کہ اسے

کچھ کامیابی ہوئی یا نہیں اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ دارو والا بلڈنگ کے غنڈے مار تھاسیت ضمانت پر رہا ہو گئے تھے اور حمید مار تھا کے ساتھ مصروف تفتیش تھا۔ فریدی نے بھی اس طرف دھیان نہیں دیا۔

آج بھی حمید نے پہلے ہی سے کوئی خاص قسم کا پروگرام بنارکھا تھا لہذا جب فریدی نے اُسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو وہ پھیل گیا۔

”میں کہیں نہیں جاسکتا! خواہ مخواہ مجھے بور نہ کیجئے۔ میں پرویز والے معاملے میں الجھا ہوا ہوں۔“

”اسی سلسلے میں تمہیں تکلیف دی جا رہی ہے۔“ فریدی بولا۔

”کیوں آپ نے تو کہا تھا کہ میں کسی دوسرے معاملے میں مصروف ہوں۔“

”فی الحال میں نے اُسے ملتوی کر دیا ہے۔“

”لیکن میں دوسرا پروگرام بنا چکا ہوں۔“

”شٹ اپ!....!“ فریدی بگڑ کر بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم آج کل اسی بہانے کس قسم کے

پروگرام بنارہے ہو۔ تم کل رات بھی مار تھا کے ساتھ آر لکچو میں رقص کر رہے تھے۔“

”تو پھر!....!“ حمید نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ”میں اس کی پوجا کر کے تو مجرم تک پہنچ نہیں سکتا۔“

”چلو کپڑے پہنو۔“ فریدی نے اُسے اس کے کمرے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد فریدی کی کیڈیلاک کپاؤنڈ سے سڑک پر نکل رہی تھی۔

”اب تو بتا دیجئے کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔“ حمید بے بسی سے بولا۔

”سعید آباد۔“

”کیا!....؟“ حمید اچھل کر بولا۔

”کیوں کوئی خاص بات۔“

”کون سا سعید آباد۔“ حمید نے پھر پوچھا۔

”تو کیا اس صوبے میں کئی سعید آباد ہیں۔“ فریدی خشک لہجے میں بولا۔

”جانتے ہیں آپ کتنی دور ہے سعید آباد۔“

”اٹھاسی میل۔“

”اس بھاگ دوڑ کا مطلب۔“

”پرویز کے سلسلہ نسب کا پتہ چل گیا ہے۔“

”جو غالباً عوج بن عنق سے ملتا ہو گا۔“ حمید نے بیزاری سے کہا۔

”وہ سعید آباد کے ایک رئیس کا لڑکا ہے۔“

”کیسے معلوم ہوا۔“

”پرویز کے کاغذات سے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اس کا سوتیلا بھائی اب بھی غالباً سعید آباد ہی

میں رہتا ہے۔“

”سوتیلا بھائی؟“ حمید چونک کر ہوا۔

”ہاں.... لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہمارا شکار وہی ہو۔ ویسے بظاہر اس حادثے کا مقصد یہی

ہو سکتا ہے کہ پرویز کی دولت ہتھیائی جائے۔“

”کیوں؟ یہ کس طرح؟“

”یہ اس طرح کہ اگر اُس شخص کا پتہ نہیں لگتا تو پرویز کا راستہ پھانسی کے تختے تک بالکل

صاف ہے؟“

”اوہ....!“

”لیکن یہ بات پھر بھی صاف نہیں ہوئی کہ اس پُر اسرار آدمی کو پرویز کے معمولات کا علم

کیونکر ہوا۔“

حمید پشیم نہ ہوا۔

تین گھنٹے بعد وہ سعید آباد پہنچ گئے۔ دن ڈھل رہا تھا اور اس چھوٹے سے شہر پر اضطحال سا

طاری ہوتا جا رہا تھا۔ سرور لاج تک پہنچنے میں انہیں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ یہ پتھر کی سلوں سے

بنائی ہوئی ایک بہت بڑی عمارت تھی جس کے سامنے ایک کشادہ پائیں باغ تھا۔ باغ کی چہار

دیواری جدید طرز کی تھی۔

فریدی کی کیڈی پھانک سے گذرتی ہوئی پور ٹیکو میں جا کر رک گئی۔

حمید کی نظریں جو ہر چیز کا مضحکہ خیز پہلو تلاش کر لینے میں کافی مشاق تھیں یہاں بھی محروم

نہ رہ سکیں۔ اس نے برآمدے میں ایک عجیب الخلق آدمی دیکھا۔ یہ تھا تو نوجوان العمر ہی لیکن

اس نے اپنا حلیہ بڑا مضحکہ خیز بنا رکھا تھا۔ اگر ڈھنگ سے ہوتا تو اس کی شخصیت یقیناً جاذب توجہ

ہوتی۔ اس نے نیلے رنگ کی سلک کا ایک لمبا سا لبادہ پہن رکھا تھا اور پیروں میں غالباً خرگوش کی کھال کے سلیپر تھے۔ ڈاڑھی مونچھیں صاف تھیں۔ سر کے نچلے حصوں میں گنے اور سیاہ بال تھے۔ بچ کا حصہ بالکل صاف اور سپاٹ تھا۔ شاید اس نے اپنی بھینٹیں بھی مونڈ رکھی تھیں۔

فریدی اور حمید کو کار سے اترتے ہوئے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا لیکن کچھ بولا نہیں۔ البتہ اسکے چہرے پر ایسی الجھن کے آثار نظر آرہے تھے جو تنہائی پسند آدمیوں کی طبیعت کا خاصہ ہوتی ہے۔

”ہیلو....!“ اس نے اپنی آنکھوں کو گردش دی۔

فریدی اور حمید اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ حمید کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کے سر کے درمیانی حصے کی صفائی میں قدرت کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ اس پر آسترہ چلایا گیا تھا۔

”کیا تنویر صاحب تشریف رکھتے ہیں۔“ فریدی نے پوچھا۔

”تنویر صاحب تشریف رکھتے ہیں فرمائیے۔“ وہ کھٹکھٹاتی ہوئی آواز میں بولا۔

فریدی نے اپنا ملاقاتی کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔

”سی آئی ڈی انسپکٹر! گڈ گاڈ....! ہلو۔“ وہ فریدی کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”میں تنویر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”ملئے.... ملئے.... تشریف رکھئے۔“ اس نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

حمید نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پھر فریدی کو گھورنے لگا۔

”اے منذو!“ اس نے شاید کسی نوکر کو پکارا۔ ”بیگم صاحب کو بولو، سب دودھ بہا جا رہا ہے۔“

”تو آپ ہی تنویر صاحب ہیں۔“ فریدی نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

”جی ہاں۔“ تنویر نے ہاتھ ملانے کے بجائے اپنی چھڑی فریدی کے ہاتھ میں دے دی اور دروازے کی طرف دیکھ کر چیخا۔ ”ارے بھئی دودھ بہا جا رہا ہے۔“

حمید پر تو لنے لگا۔ اگر وہ تنہا ہوتا تو اس کا سر ضرور سہلاتا۔

”نہیں بہہ رہا ہے۔“ دروازے سے ایک مترنم قسم کی نسوانی آواز آئی۔

حمید اور فریدی چونک کر مڑے۔ عورت قبول صورت اور دلکش تھی۔ عمر بیس اور پچیس کے درمیان میں رہی ہوگی۔ دونوں کھڑے ہو گئے۔

”بیگم آپ سے ملئے.... فرید احمد صاحب! سی آئی ڈی انسپکٹر۔“

”فریدی۔“ فریدی نے مسکرا کر قدرے جھکتے ہوئے تسلی کی۔
 ”تشریف رکھئے۔“ بیگم نے پھر حمید کے کانوں میں شربت کی پیکاری اگائی۔
 ”سب دودھ بہہ گیا؟“ تنویر نے بچوں کی طرح اس سے پوچھا۔
 ”نہیں بہا؟“ وہ تھنجھلا کر بولی۔
 ”میں پرویز صاحب کے متعلق کچھ پوچھنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔
 ”پرویز بھائی!“ مسز تنویر چونک پڑی۔ ”ہاں ہاں فرمائیے۔“
 ”انہیں ایک حادثہ پیش آگیا ہے؟“
 ”کب اور کہاں؟“ عورت تقریباً چیخ کر بولی۔
 ”اوہ۔۔۔!“ تنویر ہاتھ بلا کر بولا۔ ”یہ پوچھو! زندہ ہے یا مر گئے۔“
 حمید نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔
 ”چپ رہئے۔“ مسز تنویر بگڑ کر بولی۔ پھر فریدی کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔ ”کہاں پیش آیا ہے کیا بات ہے ہمیں تقریباً تین چار سال سے ان کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔“
 ”ہم ان کے متعلق صرف ایک ہی بات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔“ تنویر پھر بولا۔ ”زندہ ہیں یا مر گئے۔ اگر بیمار ہیں تو کب تک مر جانے کی امید ہے اور یہ کہ کچھ بینک بیلنس بھی ہے یا خالی ہاتھ مر رہے ہیں۔“
 ”تنویر ڈارلنگ۔۔۔ خدا کے لئے۔“ مسز تنویر ہاتھ اٹھا کر بولی۔
 ”وہ کئی دنوں سے بیہوش ہیں۔“ فریدی نے کہا۔
 ”ویری گڈ۔“ تنویر اپنی ران پر ہاتھ مار کر اچھلا۔ ”تب تو جلد ہی مرنے کی امید کی جاسکتی ہے۔“
 ”مجھے افسوس ہے کہ مرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ حمید نے اسے آنکھ مار کر کہا۔
 ”ہائے سب دودھ بہا جا رہا ہے“ تنویر نے بیوی کی طرف دیکھ کر ہانک اگائی۔
 ”نہیں بہہ رہا ہے۔“ وہ دانت پیس کر بولی۔ پھر فریدی سے مخاطب ہوئی ”بتائیے نا کیسے بیہوش ہوئے؟“
 ”انہوں نے ایک عورت کو مار ڈالا ہے۔“
 ”ہائے غضب!“ مسز تنویر سینے پر ہاتھ مار کر اچھل پڑی۔

”ایک عورت نے انہیں مار ڈالا۔ ہپ ہپ ہرا۔“ تنویر تالی پیٹنے لگا۔

”چپ رہو.... چپ رہو۔“ اس کی بیوی اُسے جھنجھوڑ رہی تھی۔

بمشکل تمام تنویر خاموش ہوا۔ فریدی اُسے تیز نظروں سے گھور رہا تھا۔

”میں آپ سے کیا عرض کروں۔“ اس کی بیوی جھینپے ہوئے انداز میں کہہ رہی تھی۔

”گرمیاں شروع ہوتے ہی یہ ایسے ہو جاتے ہیں۔“

”تو اس خاندان میں سبھی ایسے ہوئے ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“

”مطلب یہ کہ یہ مرض موروثی تو نہیں۔“ فریدی بولا۔

”پرویز بھائی نے کسے قتل کر دیا۔ وہ کون عورت تھی؟“

”رعنا سلیم۔“

”نام تو بڑا حسین ہے۔“ تنویر بولا۔ ”خود بھی حسین رہی ہوگی۔ ارے بھئی دودھ بہا جا رہا ہے۔“

”نہیں بہہ رہا ہے۔“ اُس کی بیوی اس کا شانہ تھکتی ہوئی بولی۔

”رعنا سلیم کون تھی؟“ اس نے فریدی سے پوچھا۔

فریدی نے جیب سے وہی تصویر نکالی، جو حمید کو رعنا سلیم کے فلیٹ کی تلاش کے سلسلے میں

ملی تھی۔ اس میں پرویز اور رعنا سلیم دونوں ساتھ تھے۔

”یہ عورت....!“ مسز تنویر بے اختیار چیخی۔ ”ہائے غضب ثمنینہ باجی۔“

اُس نے اپنا منہ بازوؤں میں چھپا لیا۔

”ثمنینہ....!“ تنویر آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”لاؤ دیکھو تو۔“

اُس نے تصویر زمین سے اٹھالی۔

”بے شک ثمنینہ ہی ہے۔“ اس نے فریدی کی طرف دیکھ کر کہا۔ پھر اپنی بیوی کی طرف

دیکھا جو بازوؤں میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ وہ اُس کے نشانے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”ارے بھئی

.... سارا دودھ بہا جا رہا ہے۔“

”دیکھا آپ نے۔“ وہ فریدی کی طرف شکایت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ”یہ میری

بیوی ہے۔“

”ثمینہ سے پرویز کا کیا تعلق تھا۔“ فریدی نے اُس کی بات کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

”وہ پرویز کی بیوی تھی۔ اس کے ہاتھوں ماری گئی.... اور یہ بیوی بھی....!“

”چپ رہو۔“ مسز تنویر چیخ پڑی۔

”کیا ان دونوں کے تعلقات اچھے نہیں تھے؟“ فریدی نے پوچھا۔

”پتہ نہیں!“ تنویر منہ چڑھا کر بولا۔ ”تم نے خواہ مخواہ میری ننھی منی بیوی کو رلا دیا۔ ثمینہ

اس کی چچا زاد بہن تھی.... ہائے سب دودھ بہا جا رہا ہے۔“

”مستمر ہوئے والی بات ہو کر رہتی ہے۔“ فریدی نے اُسے دلا سادیا۔

”کیوں مار ڈالا.... انہوں نے کیوں مار ڈالا۔“

”یہ تو ان کے ہوش میں آنے پر معلوم ہو گا۔“

”کیا ہوش میں آجانے کے امکانات ہیں۔“ تنویر نے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔“

”جب تو بیہوشی ہی فضول ہے۔“ تنویر بولا۔ ”یار کچھ ان کے بینک بیلنس کے متعلق تو بتاؤ۔“

”تنویر تم جانور ہو.... بالکل جانور۔“ اس کی بیوی چیخی۔

”یہ دیکھئے یہ میری بیوی ہے.... میری جان میں بھی تمہیں مار ڈالوں گا۔“

”تمہارا خاندان ہی خونی ہے۔“

”پاندان! کیا کہا پاندان۔“ تنویر بڑبڑایا۔ پھر فریدی سے پوچھنے لگا۔ ”آخر خاندان کے نام پر

مجھے پاندان کیوں یاد آ جاتا ہے۔“

تنویر کے بیوی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ ”چلو! اندر چلو۔“

”مائی ڈیز ان سیکٹر رخصت۔“ تنویر نے فریدی کی طرف دیکھ کر مایوسی سے کہا۔ ”یہ پاگل

عورت مجھے قبر ہی میں دھکیل کر دم لے گی۔ ہائے سب دودھ بہا جا رہا ہے۔“

”نہیں بہہ رہا! اندر چلو۔“ وہ اُسے دروازے کی طرف دھکیلتی ہوئی فریدی سے بولی۔ ”میں

ابھی آتی ہوں۔“

فریدی اور حمید عجیب نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد

مسز تنویر واپس آ گئی۔

”ہاں اب بتائیے انپکٹر صاحب۔“ اُس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”پوری گرمیاں مصیبت سے گذریں گی۔“

”میرا خیال ہے کہ پرویز صاحب کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔“
 ”ان لوگوں کی نسل ہی ایسی ہے۔“ وہ رازدارانہ انداز میں بولی۔ ”ان کے باپ بھی تھوڑے سے جھکی تھے۔“

”پرویز اور ثمنینہ کے تعلقات کیسے تھے؟“ فریدی نے پوچھا۔

”پہلے تو اچھے تھے۔“

”پہلے سے کیا مطلب۔“

”پانچ سال قبل ہم سب اکٹھا رہا کرتے تھے۔ اس وقت ان کے باپ حیات تھے۔ ان کے انتقال کے بعد بنوارہ ہو گیا۔ پرویز نے اپنی غیر منقولہ جائیداد بیچ ڈالی اور ثمنینہ کو لے کر کہیں چلے گئے۔ اس کے بعد ان کا کچھ پتہ نہیں کبھی سننے میں آیا کہ افریقہ میں ہیں.... اور کبھی جنوبی افریقہ میں۔“
 ”ثمنینہ آپ کی چچا زاد بہن تھی۔“

”جی ہاں۔“

”اس کے والدین کا پتہ بتائیے۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میرے علاوہ ان کا کوئی عزیز قریب زندہ نہیں۔“

”تویر صاحب کے علاوہ پرویز کا کوئی اور وارث۔“ فریدی نے پوچھا۔

”خدا کے لئے تویر صاحب کی باتوں پر دھیان نہ دیجئے گا۔ گرمیوں بھر ان کی یہی حالت رہے گی۔ اکثر مجھ سے کہتے ہیں کہ خدا کرے تم مر جاؤ تو میں دوسری شادی کروں۔ وہ بھی مر جائے تو تیسری کروں اور اسی طرح چوتھی.... پانچویں.... کل کہہ رہے تھے کہ میں اپنی پلکیں بھی کتر ڈالوں گا۔ کبھی کبھی کہتے ہیں کہ چہرے پر ابھری ہوئی ناک بُری لگتی ہے۔ خوبصورت آدمیوں کا چہرہ بالکل سپاٹ ہونا چاہئے۔ بعض اوقات اپنے دونوں کان پکڑ کر اکھاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ کیا ادھر ادھر نکلے ہوئے ہیں کیا خدا یہاں کنول کے پھول نہیں لگا سکتا تھا۔“

حمید ہنسے لگا اور آہستہ سے بولا۔ ”انہیں ایک شفا خانے میں داخل کر دیجئے۔ ڈاکٹر حمید بنکا شفا خانہ.... تین دن میں ٹھیک ہو جائیں گے۔“

”اور یہ دودھ کا کیا قصہ ہے۔“ فریدی نے پُر خیال انداز میں پوچھا۔
 ”دن رات باورچی خانے میں دودھ پکواتے رہتے ہیں۔ ذرا ذرا سی دیر بعد کہتے ہیں دیکھو
 دودھ بھجا جا رہا ہے۔ دودھ کبھی استعمال نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ مجھے صرف بالائی پڑنے کا منظر بڑا
 حسین لگتا ہے۔ ہاں آپ نے کسی سسر کا نام بتایا تھا۔“
 ”کوئی نہیں! یونہی۔“ فریدی نے جلدی سے کہا۔ ”تو پرویز کا کوئی اور وارث نہیں۔“
 ”جی نہیں! لیکن خدارا!... تنویر صاحب کی بات کو کوئی اہمیت نہ دیجئے گا۔“ مسز تنویر نے کہا۔

کار میں لاش

کافی رات گئے فریدی اور حمید سعید آباد سے واپس ہو رہے تھے انہوں نے بڑی دیر تک ادھر
 ادھر سر مارا تھا۔ سعید آباد کی کوتوالی میں بھی کچھ دیر ٹھہرے تھے۔ یہاں ساری پوچھ گچھ تنویر ہی
 کے متعلق ہوئی تھی۔ تنویر کے خاندان سے واقفیت رکھنے والے بھی یہ نہ بتا سکے کہ پرویز نے
 کہاں بود و باش اختیار کر رکھی تھی۔ تنویر کے متعلق سب نے تصدیق کی کہ گرمیوں میں اس کا
 دماغی توازن گڑبڑا جایا کرتا ہے۔

تنویر کا شمار سعید آباد کے نیک نام اور خدا ترس لوگوں میں ہوتا تھا۔ فریدی نے اس کے
 متعلق جو معلومات فراہم کی تھیں انہیں مد نظر رکھتے ہوئے کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ پرویز
 والے معاملے میں اس کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے۔

”مگر اس کا پاگل پن عجیب ہے۔“ حمید نے کہا۔

”ہے تو۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”لیکن۔“

وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”میں اس سے ایک بار پھر ملوں گا؟“ حمید نے کہا۔

”مگر پاگلوں سے تو تم ڈرتے ہو۔“

”سنیہہ قسم کے پاگلوں سے نہیں۔ میں انہیں پاگلوں سے ڈرتا ہوں جن سے جان پہچان نہ

ہو۔ اچھا بھلا بتائیے میں کبھی آپ سے ڈرا ہوں۔“

فریدی شاید جواب دینے کے موذ میں نہیں تھا یا پھر شاید کچھ اور سوچ رہا تھا۔

”آپ شاید اس کی بیوی کے متعلق سوچ رہے ہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”ہونا بھی چاہئے۔ قدرتی بات ہے۔ جب کوئی مجرد آدمی کسی شادی شدہ جوڑے کو دیکھتا ہے تو دل میں ٹیس ضرور اٹھتی ہے۔ اگر آج آپ شادی شدہ ہوتے تو آپ کی بیوی بھی بیچاری ملنے والوں سے یہی کہتی کہ آپ ان کی باتوں کا بڑا نہ ماننے گا۔ یہ جو بیسوں گھٹے سراغ رساں رہتے ہیں۔“

”یہ بات بھی اب صاف ہو گئی کہ ثمنینہ پرویز کی بیوی تھی۔“ فریدی بولا۔ ”لیکن پیشہ کرتی تھی۔“

”ٹھیک یاد آیا! آپ نے اس اطلاع سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ پرویز کی بیوی ہی ہو سکتی ہے آخر آپ نے اس کا اندازہ کیسے لگا لیا تھا۔“ حمید نے کہا۔

فریدی کچھ دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔ ”صرف بیوی ہی کی بیوفا کی کسی آدمی کو اتنا بھیانک بنا سکتی ہے۔“

”کیوں؟ کیا کسی محبوبہ کی بے وفائی آدمی کو انتقام پر نہیں اکسا سکتی۔“ حمید نے کہا۔

”اکسا سکتی ہے لیکن ایسے معاملات میں یہ آگ دیر تک نہیں سلگتی.... محبوبہ کسی دوسرے کی ہو کر بچے جننے میں مشغول ہو جاتی ہے اور عاشق کچھ دنوں تک تو دردناک قسم کے فلمی گیت گاتا رہتا ہے پھر وہ بھی اپنی راہ لگ لیتا ہے یا زیادہ تاؤ باز ہوا تو موقع ملنے پر انتقام لے لیتا ہے لیکن وہ بھی پہلی فرصت میں۔ زیادہ دنوں تک یہ روگ نہیں پالتا۔“

”لیکن میں نے تو ایسے بھی عاشق دیکھے ہیں جو محبوبہ کے بچوں سے خود کو ماموں جان کہلواتے ہیں۔“ حمید بولا۔ ”مگر پرویز۔“

”پرویز تین سال سے تنہا تھا۔“ فریدی نے کہا۔ ”ممکن ہے اُسے علم ہی نہ رہا ہو کہ اس کی بیوی کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے جب کوئی عورت اپنے شوہر کو چھوڑ دیتی ہے تو خواہ شوہر کو اس سے محبت رہی ہو یا نہ رہی ہو اس کی مردانگی کو ضرور ننھیں لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی مردانگی کی توہین سمجھتا ہے اور ایک چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح انتقام کے لئے بیتاب رہتا ہے۔ پرویز نے وہ مجسمہ اسی لئے بنوایا تھا کہ اپنے اندر بھڑکتی ہوئی آگ پر چھینے دیتا رہے۔“

”کیا آپ اسے درست اور جائز سمجھتے ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”یہ کسی معلم اخلاق سے پوچھو۔“

”نہیں میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں۔ آپ کی ٹانگ تو دنیا کے ہر معاملے میں اڑی ہوئی ہے۔“
 فریدی تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔ ”میرے خیال میں شادی عورت اور مرد کے
 درمیان محض ایک سماجی معاہدہ ہے۔ اگر طرفین میں سے کوئی اس معاہدے کا احترام نہ کرے تو
 اس کی سزا موت تو نہ ہونی چاہئے کیونکہ دنیا کا کوئی قانون عہد شکنی پر اتنی سخت سزا نہیں دیتا۔“
 ”مگر سوال پھر اسی جھنجھلائی مردانگی، پر آپڑتا ہے۔“ حمید نے کہا۔
 ”جھنجھلائی ہوئی نہیں بلکہ مشتبہ مردانگی کہو۔“

”مشتبہ کیوں؟“

”ایسے معاملات میں بیوی کو قتل کر دینے والے معمولاً اپنی مردانگی میں شبہ رکھتے ہیں۔ لہذا
 ان کی غیر شعوری خواہش یہ ہوتی ہے کہ اپنی جنسی کمزوری کے اُس چلتے پھرتے اشتہار کو ہمیشہ
 کے لئے ختم کر دیں اور یہ لاشعوری خواہش عموماً دیوانگی کی حد تک بڑھے ہوئے غصے کا لبادہ اوڑھ
 کر ظاہر ہوتی ہے۔ یعنی یہ خواہش منطقی شعور کو احتساب کا موقع ہی نہیں دیتی اور عمل یعنی قتل
 سرزد ہو جاتا ہے۔“

”تو اے کا یہ مطلب ہوا کہ بیویوں کی بد چلنی کی وجہ عموماً شوہروں کی جنسی کمزوری ہوتی ہے۔“
 ”نہیں ایسا تو نہیں بہترے نامردوں کی بیویاں انتہائی پارسا ہوتی ہیں اور بہترے جوان
 مردوں کی طوائفوں سے بھی بدتر۔ مثلاً وہ عورت جو جنسی ابولہوسی کا شکار ہے۔ فولاد کے آدمی کی
 بھی پابند نہیں رہ سکتی۔ اُسے تو بس اپنی زندگی میں ہر آن اور ہر لحظہ نیا پین چاہئے۔“
 ”جنسی ابولہوسی کی وجہ کیا ہوتی ہے؟“

”ہوتی ہوگی کچھ مجھے یا تمہیں اس موضوع پر کوئی مضمون نہیں لکھنا ہے۔“ فریدی اکتا کر بولا۔
 ”لیکن راستہ تو کاٹنا ہے۔“ حمید نے جھٹکے دار آواز میں کہا۔

”تو عورت ہی کا تذکرہ کیوں۔“ فریدی کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔
 ”محض اسلئے کہ مجھے ایک عورت نے جنم دیا ہے اور عورت ہی قبر تک پہنچائے گی شعر سنئے۔
 حباب آسمان میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا؛
 نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا سے جدائی کا“

”اے سورہ یہ تصوف کا شعر ہے۔“ فریدی ہنستا ہوا بولا۔

”یاشخ! میں جانتا ہوں۔ ہمہ اوست کا دم بھرتا ہوں۔ جب عورت بھی وہی اور مرد بھی وہی تو پھر یہ حجاب کہاں تک درست ہے۔ یہ سارے قطرے ایک دن مل کر دریا بن جائیں گے۔“

”ظالم تو تو فرائد سے بھی دس ہاتھ آگے نکل گیا۔ اس نے پوری انسانی زندگی کو جنسیت کے سانچے میں ڈھالا تھا اور تو نے جنسیت کے ڈانڈے ابدیت سے ملا دیے۔“

”میں اس موضوع پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“

”تو ہتھکڑیوں کا ایک جوڑا ابھی سے مخصوص کر لیا جائے۔“

”کیوں ہتھکڑیاں کیوں۔ واہ جناب Sun Bath اور Health جیسے رسالے تو کھلے عام فروخت ہوں اور میری محققانہ تصنیف پر یہ عتاب.... کتاب کا نام ”عشق مجازی سے عشق حقیقی تک ہو گا۔“

”لکھو گے کیا؟“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”یہی لکھوں گا کہ عورت اور مرد کے تعلقات پر کسی طرح کی پابندی عائد نہ کرنا حسن ازل سے کھلی ہوئی غداری ہے۔ غداروں کو کسی طرح معاف نہیں کیا جاسکتا۔ تصوف زندہ باد اور بقیہ سب کچھ مردہ باد۔ علماء کرام بائیکاٹ وغیرہ وغیرہ۔“

”تمہارے والد صاحب ابھی زندہ ہیں۔“

”اور میری کتاب پڑھ کر اُن کی زندگی اور بڑھ جائے گی۔“ حمید ہنس کر بولا۔ ”کیا سمجھتے ہیں آپ میرے ابا میاں کو.... میں جو کچھ بھی ہوں انہیں کی بدولت ہوں۔ یہ تصوف میں نے انہیں سے سیکھا ہے۔ ایک بار کا اظہر نہئے۔“

حمید نے رک کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر بولا۔ ”میں یہی کوئی بارہ تیرہ برس کا رہا ہوں گا۔ ابا میاں کے شباب کا زمانہ تھا۔ ایک رات ایک صاحبہ مردانخانے میں تشریف لائیں.... میں دوڑا ہوا والدہ صاحبہ کے پاس گیا اور انہیں گھبراہٹ میں یہ خبر دی کہ ابا میاں ابھی ابھی دو تین بوتلیں اپنے ساتھ لائے ہیں، اور انہوں نے مردانخانے کا دروازہ بند کر لیا ہے۔ والدہ صاحبہ اُن کی رنکین مزاجی سے تو واقف تھیں لیکن یہ بوتلوں والی اطلاع اُن کے لئے بالکل نئی تھی۔ غصے میں وہ چھت پر چڑھیں اور ادھر ہی سے مردانخانے میں چلی گئیں۔ پھر میں جو بھاگا ہوں تو پچا کے یہاں جا کر پناہ لی۔ مگر دوسرے دن اس بڑی طرح ادھیڑا گیا ہوں کہ خدا نے.....“

”ابے سور۔“ فریدی ہنسنے لگا۔

”دوسرا الطیفہ سنئے! اُس وقت میری عمر پانچ یا چھ سال رہی ہوگی۔ ابا نے ایک دن مجھ سے پوچھا کہ تم بڑے ہو کر کیا بنو گے۔ میں نے جواب دیا رنڈی۔ وہ منہ پھاڑ کر مجھے گھورنے لگے پھر بولے کیا بکتا ہے۔ میں نے کہا امی خالہ جان سے کہہ رہی تھیں کہ آپ رنڈیوں کو بہت چاہتے ہیں۔“

”کیوں غپ بانک رہا ہے۔“ فریدی بولا۔

”خدا قسم۔“

”خیر حمید صاحب! اگر تم مرد نہ ہوتے تو رنڈی ہی ہوتے۔“

”ہائے ہائے کیا زمانہ تھا۔“ حمید سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”بارہ تیرہ برس کی عمر میں مجھے ایک صاحب کی بیوی سے عشق ہو گیا تھا.... ہائے.... خدا کی قسم میں اس کے مہندی لگے ہوئے نرم و نازک ہاتھ کبھی نہ بھلا سکوں گا اور وہ ابھرے ہوئے ہونٹوں کے گرد لہر زتی باریک سی نتھ۔“

”نتھ! لا حول ولا قوۃ۔“ فریدی نے برا سامنہ بنایا۔ ”کیا وہ تمہاری کوئی رشتہ دار تھی۔“

”ہاں! میرے باپ کے چھوٹے سالے کی بیوی۔“

”یعنی تمہاری ممانی۔“ فریدی نے حیرت سے کہا۔

”اب تو ممانی ہی ہیں۔ مگر اُس زمانے میں میں نے سنجیدگی سے خواہش کی تھی کہ کاش وہ

میری بیوی ہوتیں۔“

”تم سے بڑا سو ر آج تک میری نظروں سے نہیں گذرا؟“

”آپ تو سو رہے کہہ کر رہ گئے لیکن ابا میاں اور امی نے خاصی پٹائی کی۔“

”کیا انہیں معلوم ہو گیا تھا۔“ فریدی کے لہجے میں حیرت تھی۔

”میں نے کبھی چھپ کر عشق نہیں کیا۔“ حمید بولا۔ ”ایک دن میں نے ممانی کو ایک عدد خط

لکھ دیا۔ لکھا کیا تھا ایک ناول سے نقل کر دیا تھا۔ اس پر ممانی نے میرے کان تھام کر دو تھپڑ اور

ماموں نے ہزاروں قہقہے لگائے۔ والدین تک خبر پہنچی تو انہوں نے الگ ادھیڑا۔“

”اس کے بعد پھر کبھی سامنا کرنے کی ہمت پڑی تھی۔“ فریدی نے پوچھا۔

”خدا کی قسم! ماموں کے سامنے انہیں آنکھ مار کر مونچھوں پر تاؤ دیا کرتا تھا وہ دونوں میاں

بیوی تو یہی سمجھتے تھے کہ میں نے ان کی چڑھ نکال رکھی ہے۔ مگر میں سنجیدگی سے عاشق ہوا تھا۔“

”اور اب۔“

”اب تو وہ سو فیصدی ممانی ہو گئی ہیں۔“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”لیکن اب میں جو اپنے ذہن کو کریدتا ہوں تو اس نکتہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہاتھ آتا۔ مجھے دراصل ان کی نکتہ سے عشق تھا۔ ہر وہ شخص جو مجھ سے قریب ہے اسے میں تصور میں نکتہ ضرور پہناتا ہوں۔ مثلاً مجھے آپ سے محبت ہے آپ کی عدم موجودگی میں جب بھی آپ کی تصویر میرے ذہن پر ابھری ہے آپ کی ناک میں نکتہ ضرور ہوتی ہے اور نکتہ کے بیچ میں سرگاہ۔“

”مارتے مارتے اُلو بتا دوں گا۔“ فریدی جھپٹی ہوئی ہنسی کے ساتھ بولا۔

”میں نے لمبی لمبی ڈاڑھیوں پر نتھیں لہراتی محسوس کی ہیں۔“ حمید نے غمگین آواز میں کہا۔

کیڑی لاک سنسان سڑک پر پھسلتی جا رہی تھی۔ دفعتاً مخالف سمت سے ایک کار برق رفتاری سے آئی اور گذر گئی۔

”کیوں...؟“ فریدی بے ساختہ چونکا۔ ”کیا یہ چیخ نہیں تھی۔“

اس نے اپنی کار کی رفتار کم کر دی اور پلٹ کر دیکھنے لگا۔ دوسری چیخ حمید نے بھی صاف سنی۔ لیکن آواز دور کی تھی۔ فریدی نے تیزی سے کیڑی پیچھے کی طرف موڑ لی۔ سڑک کے دونوں طرف گھنی جھاڑیوں اور چھپول کے گنجان جنگلوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ دو تین فرلانگ آگے ایک کار کھڑی ہوئی دکھائی دی جس کا انجن بند نہیں کیا گیا تھا۔

کار کے قریب پہنچ کر انہوں نے عجیب منظر دیکھا۔ اگلی سیٹ کی بائیں جانب کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایک آدمی جس کا سر پائیدان پر نکا ہوا تھا اور بقیہ حصہ کار کے اندر دکھائی دیا۔ فریدی نے اپنی گاڑی کی روشنی نہیں گل کی تھی۔ لیکن یہ کار ہیڈ لائٹس کی رینج میں نہ ہونے کی بناء پر کافی روشنی میں نہیں تھی۔

”نارچ او۔“ فریدی نے حمید سے کہا۔

حمید کیڑی کی طرف دوڑا۔ وہ نارچ تو نکال لایا، لیکن انجن بند کرنا وہ بھی بھول گیا تھا۔ فریدی نے اونڈھے پڑے ہوئے آدمی کو سیدھا کیا۔ چہرے پر نارچ کی روشنی پڑتے ہی وہ چونک اٹھا۔

”اوہ... کہیں دیکھا ہے اسے... مگر یہ مرچکا ہے۔“

نرخرے پر تیز قسم کے ناخنوں کے نشانات تھے۔ کسی نے نرخرا اس شدت سے دبایا تھا کہ ناخن گوشت میں اتر گئے تھے۔

”وہ اسی طرف ہو گا۔“ فریدی تیزی سے بائیں سمت کی جہازوں کی طرف مڑا۔ نارچ حمید کے ہاتھوں میں تھی۔ جب تک وہ اسے روشنی دکھائے فریدی جہازوں میں کود چکا تھا۔ حمید بھی جھپٹا پھر وہ دونوں دور تک چھپول کے جنگلوں میں گھستے چلے تھے۔ دفعتاً فریدی نے حمید سے کہا۔

”تمہیں وہیں ٹھہرنا چاہیے تھا۔ چلو... واپس چلو۔“ وہ پھر سڑک کی طرف دوڑا۔

فریدی نے جہازوں میں گھسنے سے پہلے نہ تو اپنی گاڑی کا انجن ہی بند کیا تھا اور نہ روشنی ہی بجھائی تھی۔

”یا تو کیڈی گئی یا وہ کار۔“ فریدی نے حمید سے کہا۔ وہ دوڑ رہا تھا۔

”کیوں...؟“ حمید ہانپتا ہوا بولا۔

”سڑک پر روشنی نہیں دکھائی دیتی۔“

وہ پوری قوت سے دوڑنے لگے تھے، فریدی کا اندازہ درست نکلا۔ لاش والی کار غائب تھی اور فریدی کی کیڈی کا انجن بند کر کے روشنی گل کر دی گئی تھی۔

”جلدی کرو۔“ وہ جھپٹ کر کار میں بیٹھا لیکن دوسرے ہی لمحے میں وہ کسی زخمی بھیڑیے کی طرح غرار ہا تھا۔ کئی بار کی کوشش کے باوجود بھی انجن اسٹارٹ نہ ہوا۔

”کیا حماقت ہوئی ہے۔“ وہ نیچے اتر کر انجن کا ڈھکن اٹھاتا ہوا بولا۔ ”نارچ ادھر لاؤ۔“

”چوٹ دے گیا۔“ حمید چاروں طرف دیکھتا ہوا بڑبڑایا۔

”جلد بازی ہمیشہ بُرے نتائج سے دوچار کرتی ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”مجھ سے غلطی ہوئی۔“

”کار موڑی نہیں گئی۔“ فریدی نے نارچ کی روشنی زمین پر ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر دفعتاً تیزی سے جھکا۔ دوسرے لمحے میں حمید نے اس کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی دیکھی جس پر ہیرے کے تین چھوٹے چھوٹے نگ جگمگا رہے تھے۔ فریدی اسے جیب میں ڈال کر کیڈی کی طرف جھپٹا۔ وہ پھر سعید آباد کی طرف جا رہے تھے لیکن اس بار گاڑی کی رفتار بہت تیز تھی۔

”کیا آپ نے کسی کو دیکھا تھا۔“ حمید نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”تو پھر اس بدحواسی کا کیا مطلب۔“

”اچھا تو تم یہ سمجھتے ہو کہ اس لاش نے یہ سب حرکتیں کی ہیں۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ واقعات کے اُس ڈرامائی انداز نے اُسے کچھ سمجھنے ہی نہیں دیا تھا۔ اگر وہ مرنے والے کے زرخرے پر نانخوں کے نشانات نہ دیکھتا تو مشکل ہی سے یقین آتا کہ وہ قدرتی موت نہیں مرا۔ کارڈرائیو کرتے کرتے ہارٹ فیل بھی تو ہو سکتا ہے؟

فریدی خاموشی سے اسٹرنگ پر جھکا ہوا تھا۔ کیڈی ساٹھ میل کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ وہ تقریباً تیس میل نکل آئے تھے اور سعید آباد بہت زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا۔ دفعتاً انہیں تیز روشنی دکھائی دی اور پھر جلد ہی اُس روشنی کا معمہ بھی حل ہو گیا۔ سامنے بیچ سڑک پر ایک کار شعلوں میں گھری کھڑی تھی۔ فریدی نے جھلا کر ان پر ہاتھ مارا اور کیڈی روک دی۔

”جانتے ہو! وہ کس کی لاش تھی۔“ اس نے بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“

”یہ جاپانیز مرچنٹس کارپوریشن کا وہی ایجنٹ تھا جس نے وہ مجسمہ پرویز کے یہاں پہنچایا تھا اور اب قاتل نے اس کی لاش بھی جلا دی۔“

دیوار پھٹتی ہے

فریدی چند لمبے کچھ سوچتا رہا پھر اُس نے کیڈی اشارت کر دی۔ بمشکل تمام اُس نے گاڑی کو آگے بڑھایا۔ یہ بھی بڑا خطرناک کام تھا کیونکہ جلتی ہوئی کار کے شعلوں نے سڑک کی پوری چوڑائی کو گھیر رکھا تھا بس مقدر رہی تھا کہ کیڈی آگے نکل گئی۔

”اب کہاں۔“ حمید نے کہا۔

”سعید آباد.... سر در لاج۔“

”اوہ تو کیا....؟“

”میں تنویر کو چیک کروں گا۔“ فریدی آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”آخر اس نے بھنویس کیوں صاف

کر رکھی ہیں۔ سر کا درمیانی حصہ کیوں منڈوا دیا ہے۔“

”تو کھوپڑی چیک کریں گے آپ اس کی۔“ حمید مضحکہ انداز میں بولا۔

کیڈی کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ حمید نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ دو بج رہے تھے۔

”کیا آپ تنویر پر شبہ کر رہے ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔
”قطعی۔“

”وجہ۔“

”میں اس وقت کسی بحث میں پڑنے کے لئے تیار نہیں۔ میں نے اس کے متعلق ایک بہت ہی اہم بات نہیں معلوم کی۔“
”کیا....؟“

”یہی کہ وہ عموماً گرمیوں میں ہمیشہ اپنی بھنوں وغیرہ کی صفائی کر دیتا ہے۔“
”بھئی میرا خیال ہے کہ اگر اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق ہو تا تو وہ پرویز کے بینک بیلنس وغیرہ کے متعلق کچھ نہ پوچھتا۔“

”ظاہر ہے کہ وہ خود کو پاگل بنا کر پیش کر رہا ہے۔“ فریدی بولا۔

”تو کیا وہ ہر سال گرمیوں میں پاگل بننے کی مشق کرتا ہے۔“ حمید نے برا سامنے بنا کر کہا۔
”اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن مجھے اس پر یقین ہے کہ وہ پاگل نہیں ہے۔“
”آخر اس یقین کی کوئی وجہ بھی ہوگی۔“ حمید نے کہا۔

”اس کی آنکھیں.... پاگلوں اور ہوش مندوں کی آنکھوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔“

”چلئے صاحب۔“ حمید اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

تھوڑی دیر بعد کیڈی سرور لاج کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ پھانک بند تھا۔ تقریباً آٹھ یا دس منٹ تک انہیں پھانک بلانا پڑا۔ شاید چوکیدار سو رہا تھا۔

”کون ہے؟“ اندر سے بھرائی ہوئی آواز آئی۔

”پولیس....!“

”پپ.... پپ.... پولیس.... کیوں؟“

”دروازہ کھولو۔“ حمید نے پھانک پر لات ماری۔

”شش یہ نہیں۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔

”یگم صاحب کے حکم کے بغیر.... نہیں کھل سکتا۔“ اندر سے آواز آئی۔

”اُن سے کہو انسپکٹر فریدی ہے۔“

اندر قدموں کی چاپ سنائی دی جو بتدریج دور ہوتی گئی۔

”آخر آپ کس طرح چیک کریں گے۔“ حمید آہستہ سے بولا۔

”بس دیکھتے رہو۔“

”اگر وہ تنویر ہی رہا ہوگا تو محتاط ہو گیا ہوگا اور پھر میرا خیال ہے کہ اس کی بیوی بھی اس کی

حراکتوں سے لاعلم نہ ہوگی۔“

”خدا جانے۔“

”اگر وہ تنویر ہی تھا۔“ حمید بولا۔ ”تو یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ واپس ہی آگیا ہو۔ کیونکہ وہ

کار تو اس نے جلادی تھی۔“

”ٹھیک ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن یہ تو سوچو کہ اُس نے وہ کار وہیں کیوں نہ جلادی جہاں

اُس نے اُسے پہلے چھوڑا تھا۔ اتنی دور جانے کے بعد جلانے کی وجہ کے متعلق بھی تو غور کرو۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ فریدی ہی نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

”اُس نے یہ سارے انتظامات پہلے ہی سے کر رکھے ہوں گے۔ ہم یہاں سے سات بجے چلے

گئے تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے یہاں سے ایک میل ٹرین جاتی ہے جو تقریباً دو گھنٹے میں ہمارے شہر

تک پہنچ جاتی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ جانے سے پہلے اس نے اُسی مقام پر جہاں وہ کار جل رہی

تھی ایک موٹر سائیکل چھپادی ہو۔“

”تو اُسے یہاں لاکر مارنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔“

”شہر میں اُسے لاش جلانے کا موقع نہ ملتا۔“

”پھر بھی اسی وقت یہاں آنے کی منطق میری سمجھ سے باہر ہے۔“ حمید نے کہا۔

”کیوں؟“

”ظاہر ہے کہ وہ اپنی کار بھی دیکھ چکا ہے۔ اُس نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ یہ ہم ہی ہیں۔ اس لئے

وہ کافی محتاط ہو گیا ہوگا۔“

”میں کہتا ہوں تم بس دیکھتے جاؤ۔“

”اندھیرے میں دکھائی بھی تو نہیں دیتا۔“ حمید نے جھنجھلا کر کہا۔

اندر پھر قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔

”کیا بات ہے.... کون صاحب ہیں۔“ بیگم تنویر کی کپکپاتی ہوئی مترنم آواز آئی اور حمید کی ننداسی آنکھیں یک بیک جاگ اٹھیں۔

”میں ہوں انسپکٹر فریدی۔“ فریدی نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔
 ”کیا بات ہے۔“ اندر سے آواز آئی پھر بیگم تنویر نے شاید چوکیدار کو مخاطب کیا۔ ”پھانک کھول دو۔“

کڑکڑاہٹ کے ساتھ پھانک کھلا اور فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔
 ”مسز تنویر مجھے افسوس ہے لیکن اس وقت یہاں میرا آنا بہت ضروری تھا۔“
 ”فرمائیے! اگر دیر تک ٹھہرنا ہو تو اندر چلئے۔“ اس کے لہجے میں اتنا ہٹ تھی۔
 وہ سب ایک بڑے کمرے میں آئے۔ مسز تنویر نے گہرے نیلے رنگ کی سلک کا سلپنگ گاؤن پہن رکھا تھا.... اور پیروں میں سیاہ مخملی چپلیں تھیں۔ چہرہ اس وقت پہلے سے زیادہ حسین معلوم ہو رہا تھا۔

وہ فریدی اور حمید کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔
 ”آپ کا خاندان خطرے میں ہے۔“ فریدی نے کہا۔
 ”جی؟“ وہ بے ساختہ چونک پڑی۔

”تنویر صاحب کہاں ہیں۔“
 ”اپنے کمرے میں سو رہے ہیں.... بات کیا ہے؟“ اُس کی آواز کپکپا رہی تھی۔
 ”ذرا انہیں جگاد دیجئے۔“

”جگادوں.... لیکن....“ لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔ ”آخر آپ بتاتے کیوں نہیں۔“
 ”محترمہ میں آپ کو ان الجھنوں میں نہیں ڈالنا چاہتا۔“ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔
 ”اور میں آپ کو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ اُن سے کسی معاملے پر گفتگو کرنا فضول ہے۔“
 ”کیا ان کا ذہنی توازن اتنا ہی بگڑا ہوا ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”ایک بات اور.... کیا وہ ہمیشہ ایسی حالت میں اپنی یہی وضع قطع بنائے رہتے ہیں۔“
 ”جی ہاں۔“

”بھنویں وغیرہ صاف کرا دیتے ہیں۔“

”جی ہاں! لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔“

”بہتر یہی ہو گا آپ انہیں جگا دیں۔“

”اور اگر فرض کیجئے وہ نہ جا گئے تو۔“

”جاگیں گے کیوں نہیں۔“ فریدی نے اتنے بھولے پن سے پوچھا کہ حمید اس پر قربان

ہوتے ہوئے رہ گیا۔

”وہ اکثر تین تین دن تک نہیں جاگتے۔“ مسز تیویری بولی۔

حمید چونک کر اُسے گھورنے لگا لیکن فریدی کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اُس نے کوئی غیر متوقع بات نہ سنی ہو۔

”اوہو....!“ فریدی بولا۔ ”تو انکے اور پرویز صاحب کے مرض کی نوعیت ایک ہی ہے۔“

”کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے، جو سونا شروع کرتے ہیں تو اکثر تیسرے ہی دن دروازہ کھلتا ہے۔ اس دوران میں کتنا ہی شور مچائیے! دروازہ پیٹئے لیکن شاید وہ کروٹ تک نہیں لیتے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ جب یہ کیفیت ہو تو انہیں اٹھایا ہی نہ جائے۔ اگر وہ زبردستی جگائے گئے تو اُن کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔“

”بالکل یکساں حالات ہیں۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔ پھر چونک کر کہنے لگا۔ ”محترمہ ذہن پر

زور دیجئے۔ کیا آپ کا کوئی ایسا عزیز بھی ہے جسے پرویز اور تنویر صاحبان کا ترکہ پہنچ سکے۔“

”کوئی نہیں.... کوئی بھی نہیں۔ خدا را مجھے الجھن میں نہ ڈالئے۔“

”تنویر صاحب کس وقت سونے کے لئے گئے تھے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”آپ لوگوں کے جانے کے بعد ہی انہوں نے کھانا کھایا اور اس کے بعد سونے چلے گئے۔“

”انداز کیا وقت رہا ہو گا۔“

”غالباً ساڑھے سات۔“

”کیا آپ مجھے اُن کے کمرے تک لے چلیں گے۔“

”کچھ بتائیے بھی۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔ ”اس طرح خواہ مخواہ تنگ کرنے سے کیا فائدہ۔“

”محترمہ میں ایک بار پھر تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔“ فریدی نے معذرت کی۔ ”میں

نہیں چاہتا تھا کہ آپ کو کسی الجھن میں ڈالوں۔ لیکن اب بتانا ہی پڑے گا۔“

فریدی نے مختصر اپرویز کی روداد دہرا دی۔ لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ پرویز کی بیوی اُسے چھوڑ کر طوائفوں کی سی زندگی بسر کرنے لگی تھی۔ اُس کے متعلق اُس نے یہ بتایا کہ دونوں کسی رنجش کی بناء پر علیحدہ ہو گئے تھے۔ پرویز کو اس قدر غصہ تھا کہ اُس نے اپنی بیوی کا ایک مجسمہ بنوا کر اپنے انتقامی جذبے کی تسکین کا درجہ پیدا کر لیا تھا۔ پھر اُس نے یہ بتایا کہ کسی نے اس کی بیوی کو دھوکہ دے کر اُس کمرے میں پہنچا دیا جہاں وہ مجسمہ رکھا ہوا تھا اور پرویز نے مجسمے ہی کے دھوکے میں اُس کا گلا دبا دیا۔“

تویر کی بیوی بہت زیادہ خوفزدہ نظر آرہی تھی۔

”آپ ڈر رہی ہیں نا۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”میں اسی لئے آپ کو کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔“

”نہیں میں ڈر نہیں رہی ہوں۔ آخر وہ کون ہو سکتا ہے۔“

”وہ ایسا ہی آدمی ہو سکتا ہے جسے پرویز کی موت کے بعد کوئی فائدہ پہنچ سکے۔ ظاہر ہے کہ وہ پہانسی سے نہ بچ سکے گا۔ میں تویر صاحب کے لئے بہت فکر مند ہوں۔“

مسز تویر بہت زیادہ بے چین ہو گئی۔

”اور سنئے! میں نے ابھی راستے میں اُس ایجنٹ کی لاش دیکھی ہے جس کی معرفت پرویز نے وہ مجسمہ بنوایا تھا۔ لہذا ابھیے واپس آنا پڑا۔ اس لئے کہ جلد یا بدیر آپ لوگوں پر بھی حملہ ہو سکتا ہے کہ قاتل کو پرویز صاحب اور اس مجسمے کے متعلق ایجنٹ ہی سے معلوم ہوا ہو گا۔“

”اور اس نے اس ایجنٹ کو بھی مار ڈالا۔“

”جی ہاں۔“ فریدی جلدی سے بولا۔ ”میں پرویز صاحب کا کمرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”میں عرض کر چکی ہوں ناکہ وہ اندر سے دروازہ بند کر کے سوتے ہیں۔“

”آپ کی مرضی۔“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔ ”میں نے آپ کو خطرات سے آگاہ کر دیا۔ اب آپ جانیں۔“

”ٹھہریے! میں بھلا کیا کر سکتی ہوں۔ آپ خود چل کر دیکھ لیجئے کہ کمرہ اندر سے مقفل ہے۔“

”چلئے!“ فریدی بولا۔

مسز تویر ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ فریدی نے دروازے کو دھکا دیا۔ لیکن وہ

اندر سے بند تھا۔ اس نے کوئی ایسا سوراخ یا جھری تلاش کرنے کی کوشش کی جس سے اندر جھانکا جاسکے۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ دروازے کے دونوں طرف کھڑکیاں تھیں لیکن وہ بھی بند تھیں اور ان میں بھی شیشے نہیں تھے۔“

کمرے کے اندر سے بجلی کا پنکھا چلنے کی آواز آرہی تھی۔

کانی اونچائی پر ایک روشندان نظر آیا جو کھلا ہوا تھا اور اس کے اندر گہرے نیلے رنگ کی ہلکی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

”دوسری طرف بھی دروازہ ہوگا۔“ فریدی نے آہستہ سے پوچھا۔

”نہیں۔“

”کوئی کھڑکی۔“

”کھڑکی بھی نہیں ہے۔“

”یعنی اگلی دیوار کے بعد کوئی دیوار نہیں ہے۔ اگر دروازہ ہو تا تو مکان کی پشت پر کھلتا۔“

”جی ہاں۔“

”عجیب بات ہے۔“ فریدی بولا۔ ”وہ کمرہ بھی ایسا ہی تھا جس میں پردیز کی بیوی کی لاش پائی

گئی تھی۔ عجیب معاملہ ہے مگر ہاں! اس میں تو نقب لگائی گئی تھی۔“

”خدا کے لئے کچھ کیجئے۔“ مسز تنویر مضطربانہ انداز میں بولی۔

”بائس کی سیڑھی ہوگی۔“ فریدی نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”ذرا جلدی سے منگوائیئے۔“ فریدی نے کہا۔

نوکر بھی بیدار ہو گئے تھے اور وہ کچھ دور پر کھڑے ان لوگوں کو عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد سیڑھی آگئی۔ فریدی نے اُسے روشندان سے لگا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اوپر

چڑھ گیا۔ کمرے کے اندر نیلے رنگ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ مسہری پر

پر تکلف بستر ضرور لگا ہوا تھا۔ لیکن وہ بالکل خالی تھی۔ تنویر کا پیلے رنگ کا لبادہ جو اس نے شام کو

پہن رکھا تھا، مینگر پر لٹکا ہوا نظر آیا۔ دوسری طرف یا ادھر ادھر کی دیواروں میں نہ کوئی کھڑکی

دکھائی دی اور نہ دروازہ۔

فریدی چپ چاپ نیچے اتر آیا۔ پھر نوکروں کو مخاطب کر کے بولا۔
 ”تم لوگ جا کر آرام کرو۔“

”کیا بات ہے۔“ مسز تنویر اُسے جھنجھوڑ کر بولی۔ فریدی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ وہ نوکروں کے چلے جانے کا منتظر رہا۔

”محترمہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ مجھے اس طرح اُلو بنائیں گے۔“ اس نے کہا۔
 ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“ مسز تنویر کے لہجے میں حیرت تھی۔
 ”کمرہ بالکل خالی ہے۔“

”جی۔“ اُس نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”ناممکن.... قطعی ناممکن۔“

”آپ خود دیکھ لیجئے۔“ فریدی نے روشندان کی طرف اشارہ کیا۔

مسز تنویر چند لمحے فریدی کے چہرے پر نظر جمائے رہی پھر سیڑھی کی طرف بڑھی۔
 فریدی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے قدم لڑکھڑاہے تھے۔

روشندان میں جھانکتے ہی وہ بے اختیار چیخ پڑی۔ سیڑھی کے ڈنڈے اس کی گرفت سے نکل گئے اگر فریدی نے جھپٹ کر اُسے ہاتھوں پر نہ روک لیا ہوتا تو وہ بھی اپنی چچا زاد بہن ثمنینہ کے پاس پہنچ گئی ہوتی۔ وہ بیہوش تو نہیں ہوئی تھی لیکن حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکتی۔ فریدی نے اُسے برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر ڈال دیا۔

اب حمید سیڑھی پر چڑھ رہا تھا۔ روشندان میں جھانکنے پر اُسے یہ سمجھنے پر مجبور ہو جانا پڑا کہ تنویر کی بیوی نے انہیں دھوکے میں رکھا تھا۔ وہ نیچے واپس آنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ سامنے کی دیوار میں نیچے سے اوپر تک ایک دراڑ سی پڑ گئی جو دیکھتے ہی دیکھتے کافی کشادہ ہوتی جا رہی تھی۔ حمید نے پیچھے پلٹ کر.... فریدی وغیرہ کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں اُس نے جیب سے ریوالور نکال لیا۔ فریدی مسز تنویر کی طرف سے بے خبر نہیں تھا۔ حمید کو ریوالور نکالتے دیکھ کر اُس نے مسز تنویر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کی چیخ کسی طرح نہ رک سکتی۔ ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا اور دیوار پھر برابر ہو گئی۔ لیکن یہ تنویر نہیں تھا۔ اس کے بال گھنے، گھونگھریالے اور پیچھے کی طرف مڑے ہوئے تھے، خدو خال جاذب توجہ اور دلکش تھی،

جوان اور صحت مند تھا۔

”خبردار....!“ حمید نے روشندان سے لکارا۔ ”اگر بھاگنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔“

اس نے نے گھبرا کر اوپر دیکھا اور روشندان میں ریوالتور دیکھ کر اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھالے۔

”کیا بات ہے؟“ فریدی نے نیچے سے پوچھا۔

”دروازہ توڑ دیجئے۔“

حمید نے محسوس کیا کہ وہ آدمی آہستہ آہستہ دیوار کی طرف کھسک رہا ہے۔

”اپنی جگہ کھڑے رہو۔“ حمید نے لکارا۔ فریدی دروازے سے شانہ لگائے زور کر رہا تھا۔

دروازہ کچھ زیادہ مضبوط نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ادھر دروازے میں چڑچڑاہٹ ہوئی اور ادھر نہ جانے

کیا ہوا کہ حمید سیر ہی سمیت دیوار پر پھسلتا ہوا نیچے چلا آیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ ریوالتور نہیں چلا۔

دروازہ ٹوٹ چکا تھا۔ فریدی حمید کی پرواہ کئے بغیر اندر گھس پڑا۔ کمرہ خالی تھا اور سامنے والی دیوار کی

درمیانی خلا بدستور قائم تھی۔ فریدی دیوانہ وار اُس سے گذر کر مکان کی پشت پر آگیا۔ کافی فاصلے

پر سامنے ایک تاریک سایہ دوڑ رہا تھا۔ فریدی نے بے تحاشہ اس کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔

فریدی نے اُسے جلد ہی جالیا۔ بہر حال وہ بہت زیادہ طاقتور ثابت نہیں ہوا۔ شاید وہ کچھ

گھبراہٹا ہوا بھی تھا۔ اس لئے اس نے جلد ہی ہاتھ پیر ڈال دیئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ تنویر کے ڈرائنگ روم میں اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ اُس کے دونوں ہاتھ

اس کی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور پیر بھی آزاد نہ تھے۔

تنویر کی بیوی برابر چیخے جارہی تھی۔ ”ہائے تنویر کہاں ہیں۔ تنویر کیا ہوئے۔“

”تم اپنی انگوٹھی وہیں چھوڑ آئے تھے۔“ فریدی نے اس آدمی سے مسکرا کر کہا۔

وہ کچھ نہیں بولا۔ بدستور سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”آخر اتنی جلدی کیا تھی۔“ فریدی اپنی جیب سے انگوٹھی نکالتا ہوا بولا۔ ”کل اس کا خاتمہ کر دیتے۔“

”انگوٹھی۔“ مسرتنویر انگوٹھی کی طرف دیکھ کر چیخی۔ ”یہ انگوٹھی کس کی ہے۔“

”اس کی؟“ فریدی نے بندھے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

”غلط.... بکو اس! یہ تنویر کی ہے۔“

”اور یہ کون ہے؟“ فریدی نے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

”میں نہیں جانتی۔“

”آپ اپنے شوہر کو نہیں جانتیں! حیرت ہے۔“ فریدی نے کہا اور بڑھ کر اس آدمی کے سر کے بال نوچ لئے۔ پھر بھنویں بھی نوچ ڈالیں۔ ہونٹوں پر سے پلاسٹک کے ٹکڑے نوچے۔
تویر اپنی مصنوعی وحشت سمیت اُن کے سامنے تھا۔ اس کی بیوی نے چیخ ماری اور گر کر مر بیہوش ہو گئی۔

پاگلوں کی کہانی

اس کیس نے شہر میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ اخباروں کے کرائم رپورٹر کو توالی اور محکمہ سراغ رسانی کی عمارتوں کے گرد چکر لگا رہے تھے۔ تویر حوالات میں تھا اور پرویز کو بھی پچھلی رات کو ہوش آچکا تھا لیکن ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق کسی نے بارہ گھنٹے تک اس سے کوئی گفتگو نہ کی۔ مقتول ایجنٹ کے متعلق چھان بین کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ تویر کے گہرے دوستوں میں سے تھا۔ جس کار میں ان دونوں نے سفر کیا تھا وہ کارپوریشن کی ملکیت تھی۔ تویر کی بیوی بھی اس ایجنٹ کو جانتی تھی لیکن بقیہ معاملات سے اُسے کوئی سروکار نہ تھا۔

تویر نے بڑی مشکلوں سے اعتراف جرم کیا تھا۔ سول پولیس تو اپنے سارے حربے استعمال کر کے ہار گئی تھی۔ آخر فریدی نے وہ طریقہ استعمال کیا، جو دوسروں کی نظروں میں انتہائی احمقانہ تھا۔ حمید تو سمجھا کہ شاید فریدی کے دماغ میں بھی فتور واقع ہو گیا ہے لیکن تویر کا بیان ہے کہ اگر وہ سلسلہ کچھ دیر اور جاری رہتا تو وہ سچ چچا گل ہو جاتا۔

فریدی نے اُسے ایک بڑی سی میز پر چت لٹا کر اس کے ہاتھ پیر اس طرح کس دیئے تھے کہ وہ جنبش نہ کر سکے۔ پھر اس نے اس کے سر کے دونوں طرف دو تختیاں لٹھڑی کر کے ان میں کیلیں نھکوا دیں۔ اب اس کا سر بھی جنبش نہیں کر سکتا تھا۔ آنکھیں چھت کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ پھر اُس نے ایک ہانڈی منگوائی اور اس کی پینڈی میں چھوٹا سا سوراخ کر کے اس میں ذرا سا کپڑا ٹھونس دیا۔ ہانڈی میں پانی بھر گیا اور وہ عین تویر کے سر پر چھت سے لٹکا دی گئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک ایک بوند تویر کی پیشانی پر ٹپکتی رہی۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک وہ خاموش رہا پھر اس نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔ ”وہ آئی.... وہ گری.... آ.... آ.... آ.... آئی.... گری....

گگ.... گگ.... گگ.... گری۔“

پھر وہ چیخنے لگا۔ ”میں پاگل ہو جاؤں گا.... ہٹاؤ.... اس ہانڈی کو.... فریدی مکینے سور.... ہٹاؤ.... وہ گری.... ارے میری پیشانی پھٹی۔ چھوڑ دو مجھے.... بتاتا ہوں.... بتاتا ہوں.... میں نے ہی ثمنینہ کو اس کمرے میں پہنچایا تھا۔ میں نے ہی ایجنٹ کو مارا تھا۔ وہ گری.... ارے میں مرا.... میں پاگل....!“

پھر اس نے سب کچھ اگل دیا۔ وہ ثمنینہ سے پرویز کے ایک دوست کی حیثیت سے ملا تھا چونکہ اس نے ہمیں بدل رکھا تھا اس لئے وہ اُسے پہچان نہ سکی۔ تنویر کو اس کے مجسمے کے متعلق اس ایجنٹ ہی سے معلوم ہوا تھا۔ وہ ایجنٹ تنویر کو دونوں حیثیتوں سے جانتا تھا۔ تنویر کی حیثیت سے بھی اور اُس بدلے ہوئے ہمیں میں مسٹر شمشاد کی حیثیت سے بھی۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ دونوں ایک ہی ہیں۔ اس قسم کے مجسمے اور ریکارڈ کا آرڈر چونکہ ایک نئی اور حیرت انگیز بات تھی اس لئے اس نے اس کا تذکرہ تنویر سے بھی کیا۔ وہ تصویر بھی دکھائی جس کے مطابق مجسمے کی تیاری ہوئی تھی۔ اس سے پہلے حقیقتاً تنویر کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ پرویز بھی اسی شہر میں موجود ہے۔ اس اطلاع پر اس نے خفیہ طور پر چھان بین کی تو اُسے معلوم ہوا کہ پرویز تقریباً تین سال سے تنہا رہ رہا ہے۔ ثمنینہ اس کے ساتھ نہیں ہے۔

ثمنینہ سے جس طرح اس کی ملاقات ہوئی اس کی تفصیل بھی بڑی دلچسپ تھی۔ تنویر پر شروع ہی سے گرمیوں کے زمانے میں جنسی دیوانگی کے دورے پڑا کرتے تھے لیکن وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کھلم کھلا نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اسے اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی اور وہ خاص قسم کی جنسی دیوانگی جس کا وہ شکار تھا اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسی نہیں تھی کہ کسی ایک پر قناعت کرتی۔ تنویر نیک نام بھی رہنا چاہتا تھا اور اپنی ضرورت بھی اس کے پیش نظر تھی لہذا اس نے گرمیوں کے زمانے میں خود کو سچ کا پاگل بنا کر پیش کرنا شروع کر دیا۔ ہمیں بدلنے کی غرض سے وہ ہمیشہ اپنے سر کے بال اور بھنویں منڈوا دیا کرتا تھا اور اپنی عجیب و غریب نیند کے بہانے تین تین دن تک گھر سے غائب رہتا۔ یہ ایام قرب و جوار کے شہروں یا سعید آباد ہی کی طوائفوں میں گزرا کرتے تھے یہاں آتا تو اسی ایجنٹ کے یہاں ٹھہرتا اور دونوں مل کر عیاشی کرتے۔ ایجنٹ جانتا تھا کہ وہ کس مجبوری کی بناء پر ہمیں بدلا کرتا ہے۔ لیکن اسے یہ قطعی نہیں معلوم تھا کہ وہ پرویز کا

بھائی ہے۔

ایک رات شہر کے ایک حصے میں تنویر کو شمینہ مل گئی۔ اس رات وہ اینٹ اس کے ساتھ نہیں تھا۔ تنویر نے شمینہ کا تعاقب کر کے اس کی جائے رہائش کا پتہ لگالیا اور ایک دن اُسے راہ میں روک کر اس سے پوچھا کہ وہ شمینہ تو نہیں ہے۔ اس نے شمینہ کو بتایا کہ وہ پرویز کا ایک دوست ہے اور اس کے یہاں اس کی تصویر دیکھ چکا ہے۔ شمینہ نے اُسے بتایا کہ ان دونوں میں ناچاقی ہو چکی ہے اور پرویز اُس سے ناراض ہے۔ اس پر تنویر نے اُسے یہ اطلاع دی کہ وہ تو اُسے پوچھتا ہے۔ محاورہ نہیں بلکہ حقیقتاً اس نے اس کا ایک مجسمہ بنوایا ہے اور وہ سچ مچ اس کی پرستش کرتا ہے۔ شمینہ بے قرار ہو گئی۔ کئی سال طوائفانہ زندگی بسر کرنے کے بعد وہ پھر سے گھر بسانے کے خواب دیکھنے لگی۔ اس اطلاع نے اس کا مستقبل روشن کر دیا تنویر نے اس کا اندازہ پہلے ہی لگالیا تھا کہ پرویز نے وہ مجسمہ کس لئے بنوایا ہے۔ اگر چیخوں والا ریکارڈ بھی ساتھ ہی نہ بنو اتنا تو شاید وہ بھی یہی سمجھتا کہ اس نے وہ مجسمہ اپنی محبت کی تسکین ہی کے لئے بنوایا ہے۔

اس کمرے کے متعلق جس میں وہ مجسمہ رکھا گیا تھا اینٹ سے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا۔ کمرے کی ساخت کے بارے میں معلوم کرنے کے بعد اس نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی کونے ہی پر ہو گا۔ ایک رات وہ پرویز کی کونٹھ کی پشت پر پہنچا۔ ایک روشندان سے چیخوں کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں اور پھر اس نے اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ مجسمہ اسی کمرے میں ہے۔

اس دوران میں وہ شمینہ سے برابر ملتا رہا۔ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر کبھی وہ پرویز کے سامنے چلی گئی تو وہ اُسے زندہ نہ چھوڑے گا۔ لہذا اس نے پروگرام بنانا شروع کیا کہ اسے کسی طرح اُس مجسمے والے کمرے میں پہنچا کر مجسمہ غائب کر دیا جائے۔ اس طرح سانپ بھی مرے گا اور لاش بھی نہ ٹوٹے گی۔ پرویز کی پھانسی کے بعد اس کی دولت بھی ہتھے چڑھے گی۔

شمینہ نے پرویز کا پتہ بہت پوچھا۔ مگر تنویر نے نہ بتایا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ روز روشن میں بھی وہ اس سے ملی کہ وہ اس پر حملہ ضرور کرے گا مگر یہ حملہ کسی کے بیچ بچاؤ کر دینے پر ناکام بھی ہو سکتا ہے۔

تنویر نے اس سے کہا کہ وہ پرویز کو متحیر کرنا چاہتا ہے کیوں نہ وہ اُسے اس کمرے میں پہنچا کر اس کا مجسمہ غائب کر دے۔ شمینہ نے اس تجویز کو پسند کیا پھر وہ دونوں ایک رات وہاں جا پہنچے۔

تنویر کو اندر پہنچایا اور وہاں سے وہ مجسمہ اور ریکارڈ لے کر فونیکر ہو گیا۔ یہ بات تو اُسے ایجنٹ سے معلوم ہو گئی تھی کہ پرویز نے اُس مجسمے کے معاملے میں بڑی رازداری سے کام لیا تھا حتیٰ کہ اُس نے نوکروں کو بھی اس کی ہوا تک نہیں لگنے دی تھی۔

سر جٹ حمید ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر کہتا پھر رہا تھا کہ فریدی اس صدی کا عظیم ترین پاگل ہے کہ اس نے ایک پاگل پن کی حرکت کر کے اس پاگل سے سب کچھ اگلا لیا۔۔۔۔۔ اب وہ اس تیسرے پاگل کی روداد سننے کے لئے بے چین تھا جس نے سونے کا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔ حالات کے مضحکہ خیز پہلو اس کے ذہن میں بالکل مچائے ہوئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایک شوہر بیوی سے محروم ہو گیا اور ایک بیوی شوہر سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ دونوں نے تصوف کی راہ پر زور سے دوز لگادی تھی۔

شام کو فریدی اور حمید ہسپتال پہنچے۔ پرویز جکے سے ٹیک لگائے بستر پر نیم دراز تھا۔ وہ دونوں اس کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔

”میرا خیال ہے کہ میں پہلے بھی آپ حضرات کو دیکھ چکا ہوں۔“ اس نے تفسیہ آواز میں کہا۔
”حادثے والی رات کو۔“ فریدی بولا۔

دفعۃً پرویز کے چہرے پر مرنی چھا گئی اور تھوک نگل کر خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔
”میری دانست میں آپ قطعی بے قصور ہیں۔“ فریدی نے کہا۔
”لیکن اب میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔“ پرویز مضطرب آواز میں بولا۔
”کیا آپ کو معلوم ہو گیا؟“

”جی ہاں اخبار۔۔۔ ایک مریض کی عنایت سے اخبار مجھے مل گیا تھا۔“
”بہر حال تنویر حراست میں ہے۔“

”اس نے جو کچھ بھی کیا اچھا ہی کیا۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے کوئی گزند پہنچے۔ شمینہ جب بھی میرے سامنے آتی میں اس کے ساتھ یہی برتاؤ کرتا۔“

”شروع میں تو آپ دونوں کے بہت اچھے تعلقات تھے۔“ فریدی نے کہا۔

”تعلقات۔۔۔ میں اُسے جج پوچھتا تھا۔ لیکن میں اس کے متعلق ہمیشہ دھوکے ہی میں رہا۔ میں اُسے پاک باز سمجھتا رہا۔ لیکن یہ حقیقت بعد کو واضح ہوئی کہ شادی سے پہلے ہی اس کے

تعلقات بہتہروں سے رہ چکے تھے۔ وہ حقیقتاً ایسی نہیں تھی کہ کسی ایک ہی کی ہو رہتی۔ اسی کی بدولت میرے اور تنویر کے درمیان ہوا رہا تھا۔ وہ ایسی جگہ رہنا ہی نہیں چاہتی تھی جہاں کوئی نہ کوئی ہر وقت اس کے سر پر مسلط رہے۔ رقیہ بڑی نیک عورت ہے اسی لئے ثمنینہ نے اس کے ساتھ رہنا گوارا نہ لیا؟“

”رقیہ کون؟“ فریدی نے پوچھا۔

”تنویر کی بیوی۔ ابھی ابھی یہاں سے اٹھ کر گئی ہے۔ کسی طرح تنویر کو بچائیے ورنہ وہ بے موت مر جائے گا۔“

”محال ہے۔“ فریدی بولا۔ ”اس کی گردن پر دو دو خون ہیں۔“

پرویز خاموش رہا لیکن اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ شدید ترین قلبی اذیت میں مبتلا ہے۔

”کیا آپ کو معلوم تھا کہ ثمنینہ بھی اسی شہر میں موجود ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”نہیں! وہ اب سے چار سال پہلے میرے ایک دوست کے ساتھ فرار ہو گئی تھی اور اس کے بعد سے پھر مجھے اس کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہوا۔ بہر حال انتقام کی آگ نے مجھے قریب قریب پاگل کر دیا تھا۔“

”لیکن آپ نے اسے مار کس طرح ڈالا۔“ فریدی نے پوچھا۔ ”کیا آپ کو اس کا احساس نہیں ہوا تھا کہ آپ ایک ذی روح کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔“

”اسے سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ جیسے ہی میں اندر داخل ہوا وہ کچھ کہے سے بغیر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس وقت میں نے نقب کی طرف خیال نہیں کیا تھا۔ دفعتاً میرے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر جا پڑے اور غیر شعوری طور پر میری گرفت سخت ہو گئی۔ کروں نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے چیخیں سنی تھیں لیکن مجھے اس کا بھی ہوش نہیں۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہو گیا۔ دوبارہ جب میں نارچ منگوا کر اندر گیا تو وہ مجسمہ بھی موجود نہیں تھا۔ تب کی طرف میں نے اس وقت بھی دھیان نہیں دیا تھا۔ اس کے متعلق تو مجھے آج ہی اخبار کے ریعہ معلوم ہوا۔

فریدی اور حمید کچھ دیر رسمی گفتگو کرتے رہے پھر اٹھ آئے۔

”آج آر لکچو میں بڑا زوردار پروگرام ہے۔“ حمید نے راستے میں کہا۔

”ابھی تمہارا دل پروگراموں سے نہیں بھرا۔“ فریدی بولا۔

”پتہ نہیں آپ آدمی ہیں یا بلونگ پیپر۔“

فریدی کچھ نہیں بولا۔

”ایک بات آج تک سمجھ میں نہ آئی۔“ حمید نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”کوئی شوہر اپنی بیوی کی بد چلنی نہیں برداشت کر سکتا۔ لیکن عموماً بیویاں اپنے شوہروں کی بد چلنی برداشت کرتی رہتی ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟“

”لیکن تمہاری بیوی تمہیں کبھی نہ برداشت کر سکے گی۔“ فریدی بولا۔

”تو کیا میں بد چلن ہوں۔“ حمید گڑ گڑا کر بولا۔

”نہیں تم تو فرشتے ہو۔“

”معاف کیجئے گا۔ جناب میں لڑکیوں سے صرف دوستی کرتا ہوں۔“

”ہر پڑھا لکھا بد چلن یہی کرتا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”کیا کہا۔“ حمید چیخ کر بولا۔ ”بد چلن کہہ لیجئے لیکن اگر پڑھا لکھا کہا تو اچھا نہ ہوگا۔“

فریدی ہنسنے لگا۔

”اگر ہم اس وقت آر لکچو ہی میں کھانا کھائیں تو کیا حرج ہے۔“ حمید نے کہا۔

وہ دونوں آر لکچو میں آئے۔ ڈائننگ ہال میں ابھی تھوڑی بہت گنجائش تھی۔ حمید نے ایک ایسی میز پر قبضہ جما لیا جس کے گرد و پیش کئی خوبصورت لڑکیاں تھیں۔

”افوہ یار! تم بھی کہاں آ رہے۔“ فریدی آہستہ سے بڑبڑایا۔

”کیا ان لڑکیوں سے دھشت ہو رہی ہے وہ کیسی رہے گی۔“ حمید نے ایک لڑکی کی طرف

آنکھوں سے اشارہ کیا۔

”خدا نے چاہا تو ہمیشہ بخیریت رہے گی۔۔۔ ادھر ادھر مت دیکھو۔۔۔ اے بوائے مینولاؤ۔“

فریدی نے مینو دیکھ کر کچھ چیزوں کا آرڈر دیا اور پھر کئی کھٹکتے ہوئے قمقمے اس کے کانور

میں گونجنے لگے۔ قریب کی میز پر بیٹھی چار لڑکیاں حمید کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔

فریدی نے حمید کی طرف دیکھا جو سر جھکائے نہایت سنجیدگی سے طرح طرح کے منہ بنارہا تھا۔

”کیا یہودگی ہے۔“ فریدی نے اسے آہستہ سے جھڑکا۔

”نہ جانے کیا ہو گیا ہے ہونٹوں میں۔“ حمید نے سراٹھا کر سنجیدگی سے کہا۔ ”کھجلی.... کیسی کھجلی۔“

اس نے فریدی کو بھی منہ چڑھا دیا۔

”میں جانتا ہوں.... گدھے سورا پبلک مقامات پر یہودگی کھل جاتی ہے۔“

”اب بتائیے کھجلی کو کیا کروں۔“

”جو تے سے کھجلاؤں گا۔“ فریدی بگڑ کر بولا۔

بہر حال حمید نے وہ رات فریدی پر حرام کر دی۔

اور اس کیس کے سلسلے میں بعد کے واقعات میں صرف یہی بات بہت زیادہ اہم ہے کہ عدالت نے پرویز کو قتل کی نیت نہ رکھنے کی بناء پر بری کر دیا۔ فاضل جج نے تجویز میں لکھا تھا کہ قتل ارادنا نہیں بلکہ اضطراری کیفیت کے تحت سرزد ہوا تھا۔ جس کی وجہ خوفزدگی بھی قرار دی جاسکتی ہے۔ عدالت کی نظروں میں صحیح معنوں میں مجرم تنویر ہی تھا۔ ثمنینہ کے معاملے میں اسے دس سال قید بامشقت کی سزا دی گئی اور ایجنٹ کے قتل کے سلسلہ میں سزائے موت۔

مسز تنویر کی حالت بہت ابتر تھی۔ فیصلہ سننے ہی وہ عدالت میں بیہوش ہو گئی۔ زندہ تو وہ اب بھی ہے لیکن ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر رہ گئی ہے۔ پرویز ہر طرح اس کا خیال رکھتا ہے، لیکن اس کے ذہن میں اتر جانا اس کے بس کی بات نہیں۔

ختم شد